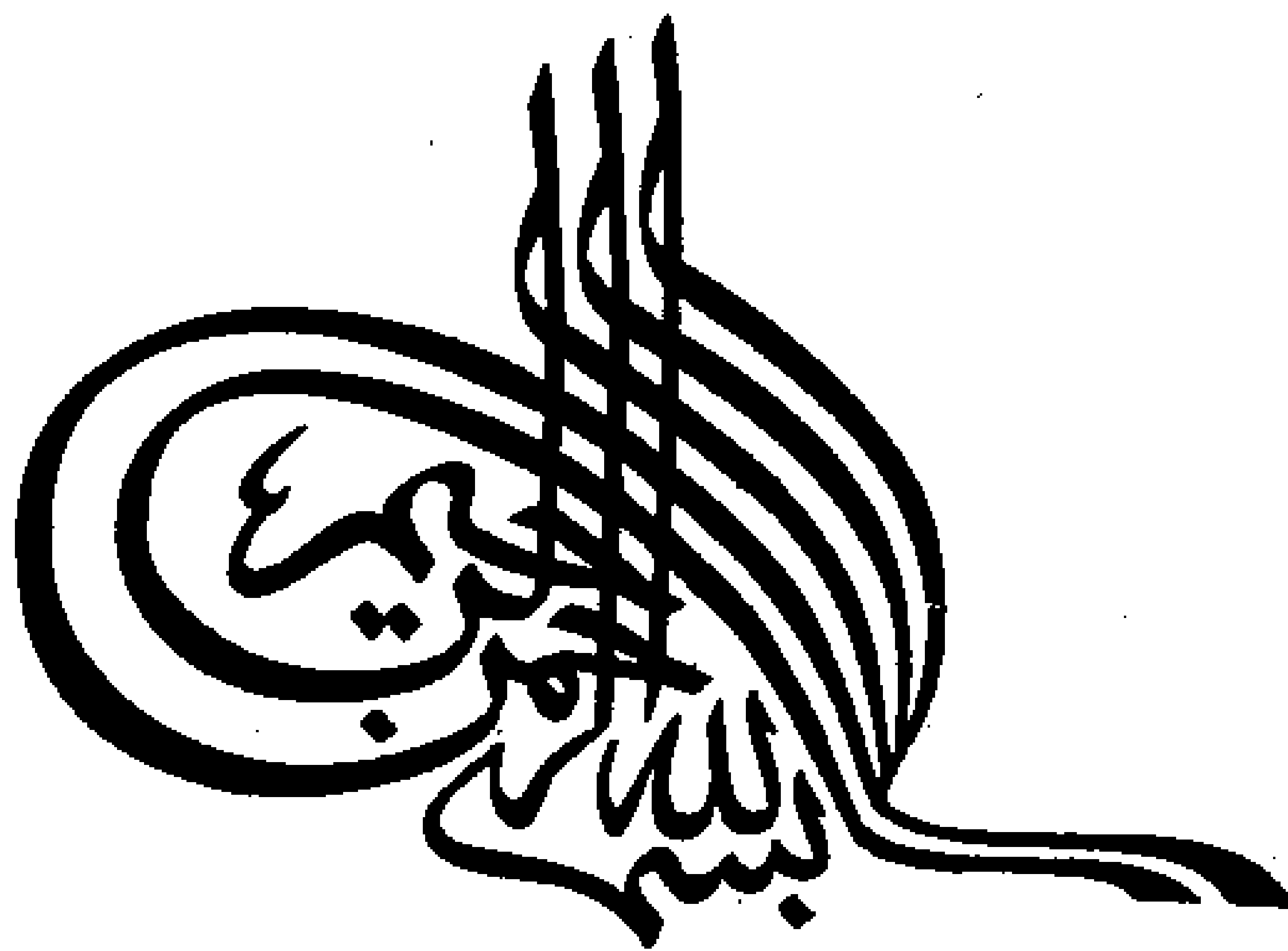
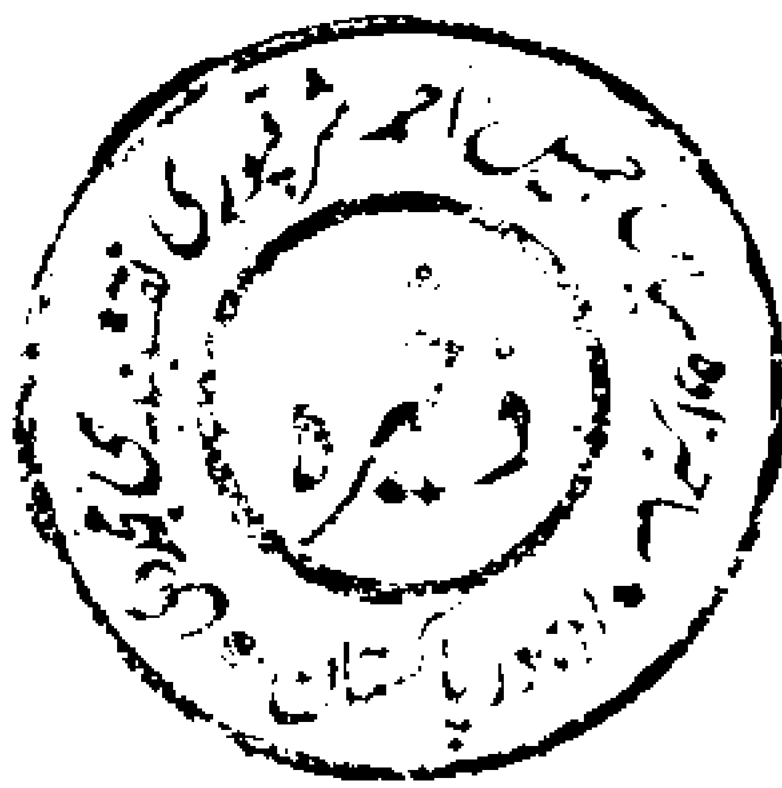




سیرِ گلستان

ایمان افروز مضامین
دلچسپ حکایات کا حسین و جمیل مجموعہ

سیرِ گلستان

رشحاتِ قلم
ملک التحریر علامہ ارشد القادری

ترتیبِ جدید:
حافظ نعمت علی چشتی سیالوی

زاویہ پبلشرز
8-C (محی الدین بلڈنگ) داتا دربار مارکیٹ۔ لاہور
فون 042-7248657 فیکس 042-7112954
Mob: 0300-9467047 - 0321-9467047 - 0300-4505466
Email:zaviapublishers@yahoo.com



بار اول ______ 1000
ہدیہ ______ 84928 120 روپے
زیر اہتمام ______ مجابت علی تارڑ

لیگل ایڈوائزرز
محمد کامران حسن بھٹہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-8800339
رائے صلاح الدین کھرل ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-7842176



مکتبہ اہل سنت امین پور بازار، فیصل آباد 0321-6639552
کتاب گھر، کمیٹی چوک، راولپنڈی 051-5552929
مکتبہ قادریہ نزد چوک میلاد مصطفیٰ سرکلر روڈ گوجرانوالہ 055-4237699
احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5558320
مکتبہ یاخی سلطان حیدر آباد 0321-3025510
مکتبہ المدینہ، فیصل آباد/ راولپنڈی/ ملتان/ حیدر آباد/ کراچی 021-2203311
اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک، راولپنڈی 0333-5205014
حنفیہ پاک پبلی کیشنز نزد بسم اللہ مسجد کھارادار کراچی
مکتبہ العطاریہ لنک روڈ صادق آباد 0333-7413467
مکتبہ قادریہ سبزی منڈی کراچی 021-4944672
مکتبہ برکات المدینہ بہادر آباد کراچی 021-4219324
عطار اسلامی کتب خانہ بازار کلاں نزد دو دروازہ سیالکوٹ 0345-6747131
مکتبہ قادریہ دربار مارکیٹ لاہور 042-7226193

فہرست

-----☆☆☆-----

آسمان کا ہیرا

قندیل عرش کا نُور وادی ظلمات میں

''اُف یہ کالی گھٹاؤں میں چُھپی ہوئی رات —— ہر طرف خوفناک سیاہی اور ہولناک سناٹا!! مگر اس وحشت ناک ویرانے میں اِنسانوں کی یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں''۔

ایک مسافر نے آگے بڑھ کر پُکارا۔

''اے آدم کے فرزندو! تم آبادیاں چھوڑ کر یہاں کہاں آگئے!''

کسی نے جواب دیا: ''خود نہیں آئے، قسمت برگشتہ لے آئی!!''

''مگر اس گھنی تاریکی میں تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی، تمہارے بچّوں کو درندے اُٹھا لے جائیں گے۔ کیا تمہیں اپنی سلامتی کی بھی فکر نہیں؟'' مسافر نے کہا۔

''ٹھوکر تو لگ ہی چکی ہے، کیا دوبارہ ٹھوکر لگے گی؟ ٹھوکر نہ لگی ہوتی تو ہمارا قافلہ یہاں سر کیوں ٹکراتا؟ سلامتی کی فکر، مت پوچھو! بڑی غمناک کہانی ہے یہ''۔ سردارِ قافلہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہا تم نے؟ ذرا کھل کر کہو۔ تمہاری باتوں سے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری گھائل زندگی کا کوئی بہت گہرا راز ہے، جسے تم چھپا رہے ہو''۔ مسافر نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ایسا ہی کچھ سمجھ لو! لیکن تم ہماری نامرادیوں کی غمگین داستان سن کر کیا کرو گے؟ اس وادی میں سینکڑوں برس گذر گئے ہمیں ٹھوکریں کھاتے ہوئے۔ تم جیسے بہت سے دردمند مسافر اِدھر سے گذرے اور کچھ دیر کیلئے ہمارے پاس ٹھہر گئے تمہاری ہی طرح انہوں نے

بھی ہمیں اس زندان بلا سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہم نے اپنی مصیبتوں کا دردناک آزاران سے بیان کیا تو وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ تمہارے زخم کا علاج انسانوں کے بس نہیں ہے۔ انتظار کرو، شاید آسمان سے تمہارے لئے کوئی مرہم شفا اُترے۔

اس لئے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ضد نہ کرو۔ ہماری تھکا دینے والی حسرت انگیز کہانی سُن کر تم بھی وہی کرو گے جو تمہارے پیش رو کر چکے ہیں۔ تم ایک مسافر ہو، جاؤ اپنا راستہ پکڑو" تمہاری ہمدردیوں کا بہت بہت شکریہ" سردار قافلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اَب تو اور بھی تمہاری باتوں نے مجھے سراپا شوق بنا دیا —— اَب میں تمہاری داستان غم سنے بغیر یہاں سے ٹل نہیں سکتا۔ یقین کرو! میں ان راہگیروں میں نہیں ہوں جو تمہاری پُرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستین رکھ کر چلے گئے۔ میں نے خود بھی دردِ الم کے گہوارے میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے تمہارے دل کی دھڑکنوں کا راز مجھ پر چھپ نہیں سکتا۔ اَب تمہیں اپنا قصۂ غم سنانا ہی ہوگا" مسافر نے پیار بھرے انداز میں جواب دیا۔

"فطرت انسانی میں کتنی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی نقشہ تھا ان راہگیروں کا بھی جو تمہارے لفظوں میں ہماری پُرنم آنکھوں پر صرف اپنی آستین رکھ کر چلے گئے۔ وہ بھی ہمارا فسانۂ ابتلا سننے کے لئے اِسی طرح بیتاب تھے جس طرح تم ہو۔ اظہار شوق کے مرحلے میں تم اور وہ بالکل یکساں نظر آتے ہو۔ اس کے بعد کی منزل میں تم ان سے مختلف ہو جاؤ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

بہر حال تم ہماری کہانی سننے پر بضد ہو تو سُنو! لیکن اس امید میں نہیں کہ ہماری مشکلات کی گرہ کھول دو گے بلکہ صرف اس لئے کہ ہمارے قافلہ سے تم دل شکستہ ہو کے نہ جاؤ"۔ اتنی گفتگو کے بعد سردار قافلہ نے ایک لمبی سانس لی اور داستان سُنانا شروع کیا۔

"دیکھو! بہت دنوں کی بات ہے۔ نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ اس وقت کی جب روئے زمین پر انسانوں کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی اس وقت کائنات کے خدا نے آسمان پر ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا۔

ایک عرصۂ ناپیدا کنار تھا، جس میں ایک طرف بلند قامت پہاڑوں کے لنگر کھڑے

تھے، دوسری طرف زمین کا گول کُرہ رکھا ہوا تھا، اور ٹھیک پائے گاہِ شاہی کے سامنے انسانی روحوں کی بھیڑ جمع تھی، جب ساری خلقت آ موجود ہوئی تو خدائے لاشریک نے اپنے سرا پردۂ جلال و جبروت سے ایک چمکتا ہوا ہیرا نکالا —— اس کی تابش جمال کا کیا حال بیان کروں کہ کسی میں نظر ملانے کی تاب نہ تھی۔ بس نگاہوں پر ایک تیز تر شعاع کی چوٹ پڑی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

خدائے فلک نے تمام حاضرین دربار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''دیکھو! یہ میرے گنجینۂ قدرت کی ایک نہایت قیمتی امانت ہے جو اس کی حفاظت کا حق ادا کر سکتا ہو وہ آگے بڑھے۔ یہ ہیرا میں اس کے حوالہ کر دوں گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایک لمبی مدت کے بعد پھر ایک دربار عام منعقد کروں گا۔ اس دن یہ امانت بالکل اسی حالت میں واپس کرنا ہو گی۔ اور یہ بھی سُن لو کہ ادائے حق میں ذرا بھی کوتاہی ہوئی تو جہاں میری بارگاہ عدل میں محنت وفا کا شاندار صلہ ہے، وہاں سرکشی کی عبرت ناک سزا بھی ہے''۔

خدائے برتر کا یہ اعلان سن کر ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں عام طور پر خیال تھا کہ آسمان کا چوڑا چکلا سینہ یہ بار امانت ضرور قبول کرے گا۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب آسمان پر یہ امانت پیش کی گئی تو دہشت سے اسے زلزلہ آ گیا۔ ہیرے کیلئے پتھر کا جگر مشہور ہے۔ آسمان کے انکار کے بعد اَب خطاب شاہی پہاڑوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''کرۂ خاک کے پہرہ دارو! کہو تو تمہارا سینہ چاک کر کے یہ امانت رکھ دوں؟''

یہ سُنتا تھا کہ پہاڑوں کی مغرور پیشانی پر پسینے آ گئے گھٹنے ٹیک کر عرض کیا: ''ہماری چوٹیوں کو رفعت کا تاج بخشنے والے مالک! تیری امانت کا جلال ہم سے نہیں اٹھ سکتا۔ ہمارا سینہ پھٹ جائے گا، ہماری کمر ٹوٹ جائے گی''۔

اَب زمین کی باری تھی —— فرمان سلطانی اس سے یوں مخاطب ہوا:

''اے آغوش فطرت! تیرے دامن پر شاخ گل سے کوئی ننھا سا دانہ بھی گر جاتا ہے تو تُو اُسے ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تیری ہی دیانت و وفا پر نباتات کی انجمن آباد ہے۔ میرے خزانۂ کرم کا یہ ہیرا تو ہی اپنے دل میں رکھ لے نا؟''

یہ سُن کر زمین نے اپنا خاک آلود چہرہ ایوان شاہی کی دہلیز پر رکھ دیا اور لرزتے ہوئے کہا:
"اے جبروت والے بادشاہ! تو خوب جانتا ہے کہ تیری چھوٹی بڑی کائنات کے قدموں سے پامال ہونے والی میں ایک عاجز و کمترین مخلوق ہوں۔ بھلا میرے اندر کہاں اتنا حوصلہ کہ تیری پر جلال امانت کا بار اٹھا سکوں؟"

اس بھرے دربار میں سب کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ سب کی نظر اپنی ہی نجات و سلامتی پر تھی۔ —— لیکن انسان کھڑا سوچتا رہا کہ ایک بندۂ وفا شعار کو اس بحث سے کیا سروکار کہ حق امانت ادا کرنے کی اہلیت اس میں ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مالک کی رضا کیا ہے؟ مشیت یہ امانت کسی کے حوالہ کرنا ہی چاہتی ہے تو اُسے قبول کرنے میں پس و پیش کیوں کیا جائے؟ جو امانت دے رہا ہے وہی اہلیت بھی بخش دے گا اور بالفرض اگر دوست کی خاطر ہم ہلاک بھی ہو گئے تو اس میں زیاں کیا ہے؟ یہ سوچ کر انسان آگے بڑھا اور اس نے انجام سے بے خبر ہو کر ہیرے کو اٹھا لیا۔ اس مجمع کائنات میں سب کے سب حیرت سے انسان کا منہ تکتے رہ گئے۔ اس کی بے محابا جرأت پر بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا۔ خود شاہ فلک نے انسان کی جسارت بے خطر دیکھ کر کہہ دیا۔ "غضب کا ظالم ہے انجام سے بے خبر انسان بھی"۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔

اس کے بعد دنیا میں انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی نسل ساری زمین پر پھیل گئی —— ہر عہد میں کچھ خاص قسم کے انسان شہنشاہ کی طرف سے دنیا میں آتے رہے جنہوں نے ہاتھوں ہاتھ اس ہیرے کی حفاظت کی۔ وہ تمام نسل انسانی کو اپنی زندگی میں ہدایت کرتے رہے کہ خبردار وہ ہیرا ضائع نہ ہونے پائے ورنہ آئندہ جو دربار منعقد ہونے والا ہے اس میں انسانوں کی بڑی ہی رسوائی ہوگی۔

میرے مہربان مسافر! آج ہزاروں سال کا عرصہ گزرا کہ اس ریگستانی ملک میں شام کا ایک بوڑھا معمار اپنے شیر خوار بچے اور اپنی وفادار بیوی کو لے کر آیا اور ایک بے آب و گیاہ

پہاڑی کے دامن میں چھوڑ کر چلا گیا ——— دمِ رخصت اس کی یہ مناجات بڑی ہی رقت انگیز تھی۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔

"پروردگار! تیرے محترم گھر کے قریب، ایک بے آب و گیاہ ریگزار میں مَیں نے اپنی نسل کو آباد کیا ہے۔ اَب تو ہی ان کا نگہبان ہے"۔

دنیا سے رحلت کرتے وقت مقدس باپ نے وہ آسمانی ہیرا اَپنے اسی ارجمند بیٹے کے حوالہ کر دیا ——— یہ ہمارا قافلہ جو تم دیکھ رہے ہو، اسی کی نسل سے آباد ہے۔ جس وقت ہمارا مورثِ اعلیٰ دنیائے فانی سے رخصت ہو رہا تھا، اس نے خاندان کے بڑے بوڑھوں کو اَپنے قریب بلایا۔ جب سب آکر اس کے گرد جمع ہو گئے، تو اس نے اَپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر وہ ہیرا نکالا اور ہچکیاں لیتے ہوئے قوم کے سرداروں سے کہا۔

"دیکھو! موت میرے سرہانے کھڑی ہے۔ اور عنقریب وہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کی ایک دیوار حائل کر دے گی۔ اس حالت میں جبکہ میری آنکھیں پتھرا رہی ہیں اور ہمیشہ کیلئے میں تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ نسلِ انسانی کے آباؤ اجداد سے جو آسمانی ہیرا ہاتھوں ہاتھ مجھ تک پہنچا ہے میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں ——— میری حیات کے یہ آخری جملے تم دل کی تختیوں پر لکھ لو۔ سب کچھ بھول کر بھی اسے نہ بھولنا۔

دیکھو! یہ دنیا اَب اَپنے آخری مرحلہ سے گذر رہی ہے۔ عنقریب یہ اسی نقطہ پر پہنچنے والی ہے جہاں سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ لیکن تم سے پہلے مجھ سے پہلے اِنسانوں کے لاکھوں کارواں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

تم چھوٹے بڑے سب گواہ رہنا کہ تم تک یہ امانت پہنچا کر میں اَپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا ——— اَب نسلِ انسانی کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے تمہیں گذرنا ہو گا۔ قدم قدم پر رہزنوں کی بھیڑ تمہاری تاک میں ہو گی ——— خدائے قدیر تمہیں سفر کی ارجمندی اور راہ کی سلامتی نصیب کرے۔

اتنا کہہ کر ہمارے قبیلہ کے بوڑھے باپ نے ہمیشہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اور ہمیں یتیم بنا گیا"۔

یہاں پہنچ کر سردار قافلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس کی آواز رقت انگیز ہو گئی ـــــ تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر کہا۔

''میرے غمگسار مسافر! اس حادثہ کے بعد کئی سو برس تک ہمارے قافلہ میں ہاتھوں ہاتھ وہ ہیرا منتقل ہوتا رہا اور ہم خوشی خوشی زندگی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ لیکن ایک دن ہم اسی وادی سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ ہیرا گر پڑا ـــــ اندھیری رات تھی، ہر چند ہم نے تلاش کیا، وہ نہ ملا۔

اس وقت سے لے کر آج تک ہم اسی ہیرے کی تلاش میں یہاں رُکے ہوئے ہیں۔ اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے ہمارا سارا قافلہ گھائل ہو چکا ہے۔ کتنی مرتبہ ہم سو کر جاگے اور جاگ کر سوئے، لیکن نہ جانے کتنی لمبی رات ہے کہ اب تک سحر نہ ہوئی۔

آہ! اب کس منہ سے ہم آسمانی دربار کا رخ کریں گے۔ جو لوگ ہم سے پہلے جا چکے ہیں وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے مگر انہیں کیا خبر کہ درمیان راہ میں ہماری متاع حیات لٹ گئی؟ وائے حسرت ناشکیب! کل کے منعقد ہونے والے آسمانی دربار میں نسل انسانی کے تمام افراد ہمیں کیا کہیں گے؟ فرزندان آدم میں ہم لوگ کس قدر ننگ پیدا ہوئے تھے''۔

سردار قافلہ جب اپنی پوری کہانی سُنا چکا تو مسافر نے سر اٹھایا اور دلنواز لہجے میں کہا ـــــ ''سردار قافلہ! اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری سرگذشت زندگی رنج و محن کا ایک عبرتناک مجموعہ ہے ـــــ تمہارا قافلہ اس وقت جس وادی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے متعلق ایک تاریخی راز میرے سینے میں محفوظ ہے۔ موقعہ سے بات نکل آئی ہے تو سُن لو۔

''یہ کفر و ضلالت کی وادیٔ ظلمات ہے۔ یہاں تاریکیوں کی راجدھانی ہے۔ اس وادی میں سُورج کی کرنوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ یہاں کسی نے آج تک صبح کا چہرہ نہیں دیکھا''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے لئے کرب و الم کا یہ بڑا ہی دردناک حادثہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مطمئن ہوں کہ امید کا چراغ گل نہیں ہوا ہے۔ تم اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں سرگرداں تو ہو۔ بس گھبراؤ نہیں۔ شہنشاہ فلک کی بارگاہ بڑی عاجز نواز بارگاہ ہے۔

اس ظلمت کدۂ بلا میں تمہارے لئے وہاں سے ضرور کوئی روشنی اُترے گی اور تم اپنا گم شدہ ہیرا پالو گے'' مسافر نے تسلّی آمیز لہجہ میں کہا۔

لیکن ہم بد بختیوں کی آخری حد پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمارے کہاں ایسے نصیب کہ شہنشاہ کی رحمت کنگرۂ فلک سے ہماری چارہ سازی کیلئے آئے اگرچہ اس کے کرم کا سمندر ناپید کنار ہے، مگر ہم تو ایک قطرۂ آب کیلئے ترس رہے ہیں کاش! اس کی موجوں کا پسینہ ہی بن جاتا''۔

اتنا کہتے کہتے سردارِ قافلہ کی آواز گلوگیر ہوگئی اور بیساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی'' ہائے میرا ہیرا!!'' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مسافر سے اَب یہ رقّت انگیز حال دیکھا نہ جاسکا۔

''شہنشاہِ فلک کی رحمتِ مجسّم تمہارے سامنے کھڑی ہے اور تم اپنی بختیوں کا ماتم کر رہے ہو''؟ یہ کہتے ہوئے فوراً اس نے اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔

نقاب الٹنا تھا کہ اچانک فضا روشنی سے بھر گئی اور وادیٔ ظلمات کا ذرّہ ذرّہ چمک اٹھا۔

اس کے بعد اس نے ریت کے ایک ڈھیر پر اپنی نگاہ برہم کی ایک تیز شعاع ڈالی اور انگلی اٹھا کر اشارہ کیا——''وہ دیکھو تمہارا ہیرا چمک رہا ہے!''

سردارِ قافلہ نے دوڑ کر اسے اُٹھالیا۔

اس حیرت انگیز واقعہ پر قافلہ والے دم بخود ہو کر رہ گئے جو جہاں تھا وہیں دیوارِ حیرت بنا کھڑا کا کھڑا رہا۔ انہیں اتنی بھی مہلت نہ مل سکی کہ اپنے گمشدہ ہیرے کی بازیافت پر خوشی کا مظاہرہ کریں۔

سردارِ قافلہ نے ادھر ہیرا اُٹھایا اور اُدھر مسافر نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالی اور یہ کہتا ہوا رخصت ہونا چاہا——''اچھا میں جا رہا ہوں۔ اب میری ملاقات وہیں ہوگی جہاں تمہیں یہ امانت واپس کرنی ہے۔ میں خداوندِ فلک کی آخری روشنی ہوں، بالکل آخری!''

مسافر اتنا کہہ کر قدم اٹھانا ہی چاہتا تھا کہ سردارِ قافلہ نے آگے بڑھ کر اس کے عبا کا دامن تھام لیا۔

''میرے چارہ ساز! ابھی کہاں تم جا سکتے ہو! دیکھو ہماری پلکوں پر ستارے چمک

رہے ہیں۔ ابھی انہیں تمہارے قدموں پر نچھاور ہونا ہے۔ تم ہمارے قافلہ میں ایک اجنبی مسافر کی طرح آئے مگر ہمارے دلوں کی سرزمین فتح کرلی —— پیارے! تم اپنی راجدھانی چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟ ابھی تو ہم یہ بھی نہ معلوم کرسکے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو" سردارِ قافلہ نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔

"ویسے دامن جھٹکنے کی میری عادت نہیں! لیکن تم یہ جاننے کی کوشش نہ کرو کہ میں کون ہوں؟ تمہارا گوہرِ مقصود تمہیں مل گیا۔ تم خوشی خوشی اپنی راہ لو—— جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے وہ میرا فریضۂ کرم تھا۔ میں تم سے جزاو شکر کا طلب گار نہیں" (لا نطلب منکم جزاء و لا شکورا) بھرپور شان بے نیازی کے ساتھ مسافر نے جواب دیا۔

"لیکن کسی شخص کا تعارف تو انسان کا پیدائشی حق ہے اور پھر تم جیسا پیکرِ حیرت انسان، جیسے دیکھ کر جاننے کی کوشش نہ کرنا ہی اپنی فطرت سے جنگ کرنا ہے۔ تم دامن نہ جھٹکو میں دامن نہ چھوڑوں۔ اس سے بڑھ کر ارجمند گھڑی اور کیا ہوسکتی ہے؟ گذرے ہوئے عرصہ غم کی طرح تم اسے بھی دراز کردو۔ کفارہ ہوجائے گا" سردارِ قافلہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تم ایک مسافر ہو۔ غیر متعلق باتوں کا پیچھا کرنا مسافروں کا کام نہیں ہوتا۔ میں کون ہوں، یہ سوال تقاضائے فطرت ضرور ہے، لیکن ہر سوال کا جواب دینا فطرت کے نزدیک ضروری کب ہے؟ دیکھو! میرے دامن سے شکستہ حال انسانوں کی لاکھوں امیدیں وابستہ ہیں۔ تم مجھے اجازت دے دو۔ کتنی پُرنم آنکھیں میرے انتظار میں ہوں گی۔ تمہاری لایعنی باتوں کیلئے میرے پاس وقت نہیں ہے!" مسافر نے پُروقار لہجہ میں جواب دیا۔

"اچھا، تم نہ بتاؤ کہ تم کون ہو—— لیکن ہمارے دل کی خلجان تو دور کردو کہ تم زیرِ نقاب تھے تو ہر طرف تاریکیوں کا راج تھے اور تم بے نقاب ہوگئے تو تمہارے چہرے کی شعاعوں سے ہر طرف اجالا ہوگیا۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ ہم تمہیں کیا سمجھیں؟ انسان یا فرشتہ؟ لیکن فرشتوں کا ایسا پیکر نہیں ہوتا اور انسان کا چہرہ سورج نہیں ہوسکتا۔ اب سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ تم حیرتوں کی ایک نئی مخلوق"۔

"میرے دلنوازو! میں بڑی سماجت سے کہہ رہا ہوں کہ کبیدہ خاطر نہ ہونا"۔ سردارِ قافلہ

نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تم سے کئی بار کہہ چکا کہ میں کون ہوں؟ اس کے پیچھے نہ پڑو۔ لیکن تم اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔

میں "کون" ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تمہاری عقل وفہم سے بالاتر ہے لم یعرفنی حقیقة غیر ربی (میرے رب کے سوا مجھے اور کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟)

اَب بھی تمہاری تشفی نہ ہوتی ہو تو سنو کہ میرے جمال حقیقت پر بے شمار نقاب پڑے ہوئے ہیں تا کہ تمہارے اندر تاب نظر باقی رہ سکے اور تم میرے چہرے کی برکتیں لوٹ سکو ــــ وہ بشریت کا نقاب تھا جسے ابھی تمہارے سامنے اُلٹا تھا اور وہ میرے چہرۂ حقیقت کا سب سے پہلا نقاب ہے، جسے ڈال کر میں نے تمہاری انجمن میں قدم رکھا ہے تا کہ تم مجھ سے مانوس ہو کر میرے دامن کے قریب آسکو، اور میں تمہیں خدائے قیوم کی بارگاہ اقدس تک پہنچا دوں۔

دیدۂ انسانی میرے چہرۂ حقیقت کا جمال دیکھنے کی توانائی نہیں رکھتی۔ اس کی رسائی صرف میرے پیکر ظاہر تک ہے اور اسی سرمایۂ نظر پر دنیا مجھے بشر کہتی ہے ــــ سمجھ گئے نا!"

پس تم اَپنی نظر بھر دیکھ لو۔ پوچھ مت کہ میں کون ہوں میرے کشور حسن میں آنکھوں کیلئے اجازت نظارہ ضرور ہے پر زبان کیلئے اذن سوال نہیں ــــ تم اَپنی مقدور سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو" مسافر نے حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

لیکن تم تو اس عنصری فانوس میں بھی بشریت سے ماوراءِ نظر آتے ہو۔ اور یہ کچھ ہماری نگاہ کا اعجاز نہیں، تمہارے ہی جلوۂ آشکار کا کرشمہ ہے۔ یہی تمہارا پیکر ظاہر جسے تم نے ہمارا سرمایۂ نظر ٹھہرایا ہے، تمہارے جمال حقیقت کی غمازی کرتا ہے ــــ اَب ہم نہیں کہہ سکتے یہ ہمارا فریب نظر ہے یا فی الحقیقت تم ہی ایسے ہو"۔ سردار قافلہ نے سہمے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"فریب نظر نہیں، ایک موجود حقیقت! لیکن بہت مبہم!! جیسے بادل کے سیاہ پردوں میں چاندنی رات!!! پھر تم ہی سوچو اگر یہ اندیشہ محض بے بنیاد ہوتا تو خداوند فلک کی بارگاہِ جلال سے اس اعلان کی ضرورت کیوں پیش آتی قل انما انا بشر مثلکم نظر اَپنے نظارہ

میں آزادرہ کر بھی مجھے بشر ہی سمجھی۔ تو بتاؤ یہ کس خطرے کا دروازہ بند کیا جارہا ہے؟

میں امید کرتا ہوں کہ میری گفتگو کا اصل مدعا تم سمجھ گئے ہو گے، اور اب یہ سلسلہِ ختم کردو گے، اچھا اب مجھے اجازت دو" مسافر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"فرطِ شوق کی یہ ایک بے ارادہ لغزش تھی جو خود رفتگی میں مجھ سے سرزد ہو گئی۔ معاف کرنا میں نے بے محل سوال کر کے تمہیں زحمت دی۔ لیکن اتنا اور گوارہ کرسکو تو دم رخصت ذرا اپنا نام بتاؤ دو۔ کم از کم تمہارے نام کی یاد سے میں اپنے خاطر کو تسکین دیتا رہوں گا"۔ سردار قافلہ نے نہایت مودبانہ انداز میں کہا۔

"تعجب ہے! زمین و آسمان کے زیر و زبر سے لے کر جنّت و عرش کے بام و در تک دفتر وجود کے ہر ورق پر میرے نام کی مہر ثبت ہے اور نام بتانے کی احتیاج باقی رہ گئی ہے؟ کاش تم پوچھنے کی بجائے پڑھنے کی کوشش کرتے!

اچھا فرض کرو، ایک ایسی ہستی جو اپنی سرشت میں ہر طرح کی آلودگی سے بالکل معصوم پیدا ہوئی ہو۔ جس کا مزاجِ فطرت اتنا طیب و طاہر اتنا برتر و عالی ہو کہ مکارم و فضائل اس کے دامن میں جگہ پا کر عزت و شرف حاصل کرتے ہوں اور پھر جو اپنے محاسن و کمالات میں زمین سے لے کر کنگرۂ عرش تک ساری کائنات کا مرجع حمد و ستائش ہو تو تم ہی بتاؤ، ایسی ہستی کو تم کس نام سے پکارو گے؟" —— مسافر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

سردارِ قافلہ نے کہا: "اس کا نام سوائے محمد ﷺ کے اور کیا ہو سکتا ہے (چونک کر) تو کیا تم محمد ہو؟ تم ہی نبی آخر الزماں ہو؟ اے خوشا نصیب! تم ہی قدوسیوں کے جھرمٹ میں چمکنے والی وہ تجلی فاراں ہو جس کی خبر حضرت مسیح نے دی تھی؟"

عالم کیف میں ڈوب کر سردار قافلہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شجر و حجر کی گردنیں جھک گئیں اور دشت و کہسار کے گوشہ گوشہ سے آوازیں آنے لگیں۔

الصّلوٰة و السّلام علیك یا رسول الله

الصّلوٰة و السّلام علیك یا نبی الله

الصّلوٰة و السّلام علیك یا حبیب الله

قافلے والے بھی دست بستہ کھڑے ہو کر عشق وعقیدت کی اس انجمن میں شریک ہو گئے۔

افسوس کہ یہاں پہنچ کہ میری آنکھ کھل گئی اور اچانک یہ دلکشا نظارہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا —— اَب اگر کہیں قافلہ والوں سے ملاقات ہوئی تو میں پوچھوں گا کہ گم شدہ ہیرا پا کر انہیں زیادہ خوشی ہوئی تھی یا اقلیم عرش کے رہنے والے یزدائی مسافر کو؟

کاش نیند کا پھر کوئی جھونکا آتا اور مجھے وادی ظلمات میں اُڑا لے جاتا۔

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
جَلوہ طرازئ قد رعنا لیئے ہوئے

ارشدالقادری

ایک وُجود ـــــ دو مُتضاد حیرتوں کا مرکز!

تاریخ عالم کی دو اہم ترین راتیں

عرشِ الٰہی کے سایہ میں ملائکہ مقربین سر جھکائے کھڑے تھے کہ حجاتِ عظمت سے آواز آئی:ـــــ

ملاءِ اعلیٰ کے تمام فرشتے آج کی رات زمین پر جمع ہو جائیں۔ وہیں جہاں ہمارے جلال و جبروت کا گھر ہے۔ جو اہل زمین کا قبلۂ عبادت ہے۔

آج باعث ایجادِ عالم کا ظہور ہونے والا ہے۔ شرق و غرب، بحر و بر اور تمام اقطار ارض میں منادی کر دی جائے کہ کونین کا تاجدار آ رہا ہے۔ اس کے خیر مقدم کیلئے اپنی نگاہوں کا فرش بچھائے رکھیں۔ مکّہ کی وادیوں، ام القریٰ کے کہساروں اور حرم کے بام و در پر چمنستانِ فردوس کی بہاروں کا غلاف چڑھا دیا جائے۔ سیارۂ افلاک کے پہرہ داروں سے کہہ دو کہ اس وقت آج آفتاب کے چہرے سے نقاب نہ اٹھائیں جب تک خسروئے کائنات کی طلعت زیبا سے خاکدان گیتی کا ذرّہ ذرّہ منور نہ ہو جائے۔

ستاروں کی انجمن میں اعلان کر دو کہ آج رات کے پچھلے پہر اپنی مجلس شبینہ برخاست کر کے فرش زمین پر اتر آئیں اور مکّہ کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں۔

یہ فرمان شاہی سنتے ہی تمام فرشتے سجدے میں گر پڑے۔ رات بھر قدسیانِ فلک کے قافلے زمین پر اُترتے رہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے کنگرۂ عرش سے لے کر گل کدۂ فردوس تک کی ساری زیبائیاں وادیٔ حرم میں سمٹ کر آ گئیں۔

جیسے ہی صبح صادق کا اُجالا چمکا۔ مکّہ کی فضا رحمت و انوار سے بھر گئی۔ نقیبوں کی صداؤں

سے دشت وجبل گونج گونج اُٹھے۔ گلی گلی حوران خلد کی آنچلوں کی خوشبو سے معطر ہوگئی۔

جبریل امین ایک سبز پرچم لے کر خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ گئے —— اور حضور شاہی میں سلامی پیش کی۔

الصَّلٰوۃ و السَّلام علیك یا محمد

الصَّلٰوۃ و السَّلام علیك یا رسول اللّٰہ

الصَّلٰوۃ و السَّلام علیك یا حبیب اللّٰہ

اس صدائے سلام وتہنیت پر تمام ملائکہ سروقد کھڑے ہو گئے۔ حرم کی جھکی ہوئی دیواریں ایستادہ ہوگئیں۔ امیر کشور نبوت کی سواری اس دھوم سے آئی کہ صدائے مرحبا سے اکناف عالم گونج اُٹھے۔

حضرت روح الامین کی زبان سے جاء محمد کا مژدہ سُن کر ایک فرشتہ نے دبی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کہا: ——

تم لوگ جانتے ہو یہ محمد کون ہیں؟ جن کی آمد پر زمین سے لے کر آسمان تک تزک و احتشام اور شکوہ وجلال کا ایک عالم آباد ہو گیا ہے۔

ساتھیوں نے جواب دیا: —— اس کائنات میں کون سی مخلوق ہے جو محمد علیہ الصلوٰۃ و السلام کو نہیں جانتی۔ عرش کی چھاؤں میں لاکھوں برس بیت گئے اور تمہیں اَب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ محمد کون ہیں؟ بڑے تعجب کی بات ہے۔

فرشتہ نے کہا: —— وہ محمد جن کا نام عرش الٰہی کے بام و در پر کندہ ہے اور جن کے نور سے ہماری پیشانیاں تابندہ ہیں۔ بھلا انہیں کون نہیں جانتا۔ وہ تو چراغ انجمن ہیں۔

معاذ اللہ! یہ بات بھی پوچھنے کی تھی۔

ساتھیوں نے کہا: تو پھر پوچھنے کی وجہ؟ کیا عرش وفرش کی کائنات میں ان کے سوا بھی کوئی اور محمد ہے؟

فرشتے نے جواب دیا: —— پوچھنے کی وجہ حیرت ہے اور وہ محتاج بیان نہیں۔

تم ہی سوچو۔ وہ محمد نور مجرد سے جس کا عنصر تیار ہوا۔ اور کنز مخفی میں جس کی نشو ونما ہوئی

اور اب جس کے دم سے نورانیوں کا عالم آباد ہے۔ وہ دیارِ نور سے اس جہان تاریک میں کیوں کر آ سکتے ہیں۔

آخر ہم یہ کیسے باور کر لیں کہ وہ محمد جن کے رخ کی روشنی میں ہم لوح محفوظ کے نوشتے پڑھتے ہیں وہ یہاں آ گئے۔ کیا عرش کی قندیلیں بے نور ہو گئیں۔ یہ کرۂ ارض جو کائنات کا سب سے نچلا طبقہ ہے اور وہ محمد جس کے قدم کے قریب عالم امکان کی بلندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ دونوں میں کیا جوڑ ہے؟ عالمِ نور کا پروردۂ ناز اس ظلمت کدۂ خراب میں؟ آخر کیسے یقین آ سکتا ہے۔

ساتھیوں نے جواب دیا:——ویسے بات تو واقعی حیرت انگیز ہے لیکن غلط نہیں ہے۔ یقین کروان کی تشریف آوری امر واقعہ ہے وہ نہ آتے تو اتنا اہتمام کس کیلئے ہوتا۔

حضرت روح الامین کعبہ کی چھت پر کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا:——

آخر اس میں بحث و تکرار کی کون سی بات ہے۔ ہاں محمد تشریف لائے ہیں جو مسند نشین عرش ہیں۔ لیکن یقین نہ آنے کی وجہ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدائے ذوالجلال نے عرش و فرش کی مملکت انہیں بخش دی ہے۔

ایوان شاہی کا شکوہ و جلال مسلّم، مگر مملکت کی سوگوار آبادیوں میں قدم رنجہ فرمانا عظمتِ شاہی کے خلاف کب ہے؟ اب تک ملاءِ اعلیٰ مرکز توجہ تھا۔ اَب خاکدانِ گیتی کا طالع قسمت اوج پر ہے۔ اَب تک یہ شمع تجلّی عرش کی انجمن میں فروزاں تھی۔ اب فرش کا شبستان روشن ہوگا۔

اور تمہارا یہ استعجاب کہ عالمِ نور کا لطیف پیکر اس ظلمت کدۂ خاک میں کیوں کر آ سکتا ہے۔ خود باعث تعجب ہے۔

دُور کیوں جاؤ۔ خود اپنا ہی حال دیکھ لو۔ تمہارا یہ لطیف پیکر اس وقت کس عالم میں ہے؟ عالم گیتی کی عمر کے لحاظ سے ابھی چند ہی صدیوں کی تو بات ہے جبکہ محکمۂ اجل کے فرشتے انسانوں کی روح قبض کرنے بشر کے مثالی پیکر میں یہاں آتے تھے۔

میں خود حضرت مسیح علیہ السلام کی رُوح پھونکنے جب حضرت مریم کے پاس آیا تھا تو

میرا مثالی پیکر ایک بشر ہی کا تو تھا۔

اِس حقیقت کو سمجھنے کیلئے کافی مواد موجود ہیں کہ عالم قدس سے کسی نوری مخلوق کا بشری لباس میں آنا یہاں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں بلکہ قطعاً واقع بھی ہے۔

دُوسری رات

رجب کی ۲۶ ویں تاریخ تھی۔ رات کے گیسو ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مکّے کی ساری آبادی محوِ خواب تھی۔ تاروں کی چھاؤں میں کائنات کا مرکز آج حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں منتقل ہو گیا تھا۔ درو دیوار سے حبیب کبریا کے جلوؤں کی روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

رات کا محافظ دستہ عالم بالا سے فرش گیتی کیلئے چلنا ہی چاہتا تھا کہ حجابات عظمت سے آواز آئی:——

عرش کی قندیلوں کی روشنی تیز کر دی جائے، جنتوں کی کائنات نئے ڈھنگ سے آراستہ کی جائے۔ قدم قدم پر تجلّیات کی شمعیں روشن کر دی جائیں۔ روش روش پر بہاروں کا خزانہ بکھیر دیا جائے۔ کوثر و تسنیم کی سعید موجوں پر نور کی کرن بچھا دی جائے۔ حوران بہشتی حسن مجرد کے شفاف آبگینوں سے حجابات کے پیراہن اتار دیں۔ ملکوت اعلیٰ کے تمام فرشتے اَپنے اَپنے آسمانوں پر قطار اندر قطار کھڑے ہو جائیں۔ افلاک کے تمام سیارے ٹھہر جائیں۔ وقت کا قافلہ رک جائے۔ خیر مقدم کیلئے پیغمبران اولوالعزم آسمانوں کی گزرگاہوں پر کھڑے ہو جائیں۔ فرش گیتی سے بہ ہزاراں جاہ و جلال آج میرا حبیب یہاں تشریف لا رہا ہے۔ وہی حبیب جو میرے دست قدرت کا نقش اوّل ہے، جسے میں نے اپنی ساری کائنات کا مختار عام بنا دیا ہے۔

فرمان سنتے ہی عالم قدس میں نورانی مسرّتوں کا ایک سماں بندھ گیا۔ چشم زدن میں عالم بالا کا نقشہ بدل گیا۔ جنت کی سمٹی ہوئی بہاریں فضائے نور پہ چھا گئیں۔ آسمان کی شاہراہوں پر تجلّیات کے آئینے نصب کر دیئے گئے اور نُوری کرنوں کا غلاف عرش کے بام و در پر چڑھا دیا گیا۔ ماہتابی کنگروں پر پرچم کبریائی اس شان سے اُڑایا گیا کہ سطوت جلال سے عرش کا

پایہ ہل گیا۔ جنتوں کی سرزمین پر بہاروں نے پھول برسائے۔ نظاروں نے منہ چوما، گل ریز تبسم نے موتی لٹاتے، حسن بے نقاب نے چراغاں کیا۔ روش روش نکھر گئی، چمن چمن سنور گیا اور شباب نور کے نئے پیکر میں جگمگاتی ہوئی حوریں قطار باندھ کر ہر طرف کھڑی ہو گئیں۔ دم کے دم میں قدس کا عالم لطیف بن سنور کر آراستہ ہو گیا۔ اتنے میں آسمانی دنیا کا دروازہ کھلا۔ تجلیات کے جلو میں حضرت جبریل علیہ السلام آگے بڑھے۔ فضائے نور میں تیرنے والا براق نام کا ایک نورانی سیارہ آج ان کے ہمراہ تھا۔ آسمان کی بلندیوں سے اُتر کر سیدھے وہ مکے میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لائے۔ آج ان کے آنے کا انداز ہمیشہ سے نرالا تھا۔ دروازے کے بجائے مکان کی چھت توڑ کر اندر داخل ہوئے۔

حبیب کبریا محو خواب تھے۔ آنکھیں بند تھیں، دل جاگ رہا تھا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد حضرت جبریل آگے بڑھے اور اپنے کافوری لب محبوب کے پائے ناز سے مس کر دیئے، ٹھنڈک محسوس ہوتے ہی نشان قدرت کی نرگسی آنکھیں کھل گئیں۔ دریافت فرمایا:
"جبریل کیسے آنا ہوا"؟

سفیر غیب نے جواب دیا: — "خدائے برتر کی طرف سے حریم عظمت میں تشریف ارزانی کا پروانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ سارا عالم قدس اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کیلئے چشم براہ ہے۔ وہ سرحد تجلیات جہاں وہم و خیال کے پر جلتے ہیں۔ جہاں ملکوت اعلیٰ تک کی رسائی ناممکن ہے۔ آج وہاں آپ کو اسی لباس بشر میں خرام ناز فرمانے کی دعوت دی گئی ہے۔ حضور تشریف لے چلیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری گزرگاہوں پر امیدوں کا ہجوم ہاتھ باندھے کھڑا ہے"۔

چند ہی لمحے کے بعد خاکدان گیتی کا ایک بشر براق پر سوار ہو کر اس شان سے عالم قدس کی طرف روانہ ہوا کہ ملکوت اعلیٰ کے مرسلین نیاز مند غلاموں کی طرح رکاب تھامے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

مسجد اقصیٰ میں انبیائے سابقین کی ساری جماعتیں عقیدتوں کا خراج لئے حاضر تھیں۔ سرکار کی اقتداء میں نماز ادا کر کے سب نے امامتِ کبریٰ کے منصب کے ساتھ اپنی نیاز

84928

مندی کا کھلا ہوا اعلان کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر حضور آسمانوں کی طرف چلے۔ گزرگاہوں پر خیر مقدم کیلئے پیغمبرانِ اولوالعزم کھڑے تھے۔ ہر جگہ قدسیوں کے بیڑے سلامی کیلئے جھکے ہوئے تھے —— عرشِ الٰہی کی مانوس فضا میں داخل ہوتے ہی بیتے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ قدم پڑتے ہی عرش کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھے، بڑھتے رہے عالم بشر ہی نہیں عالم ملکوت بھی پیچھے رہ گیا۔ پھر بڑھے، بڑھتے بڑھتے اب وہاں تھے جہاں کی خبر کسی کو نہیں معلوم —— ایک محبوب اپنے محبّ سے، ایک بندہ اپنے معبود سے کس طرح ملا؟ ماتھے کی آنکھ سے ان دیکھی ہستی کا نظارہ کیوں کر ہوا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ بارگاہ شہنشہی سے محبوب کو کیا کیا خلعتیں عطا ہوئیں۔ یہ ساری تفصیلات صیغۂ راز میں ہیں —— صبح ہوئی تو سارے مکّے میں ایک شور برپا تھا —— اہل یقین و خرد خدا کو دیکھنے والی آنکھوں پر نثار ہو گئے —— لیکن نادانوں نے کہا:——

”ایک بشر کیلئے عالم بالا کا سفر ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ ساری کہانی بالکل من گھڑت ہے۔ حیرت ہے کہ ایک پیغمبر کی زبان سے اس طرح کی انہونی بات سننے میں آرہی ہے“۔

خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے چند فرشتے یہ باتیں سُن رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا:——

”تمہیں وہ رات یاد ہوگی جس کی صبح کو عبداللہ کے آنگن میں نُور کی بارش ہورہی تھی۔ زمین سے آسمان تک ہر عالم میں رحمت و مسرّت کا جشن منایا گیا تھا اور مکّے کی ساری فضا فرشتوں کے پروں سے چھپ گئی تھی —— اس موقع پر جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سارا اہتمام محمد ﷺ کی تشریف آوری پر ہورہا ہے۔ تو کچھ فرشتوں کو کتنی حیرت ہوئی تھی کہ عالم قدس کا پروردۂ ناز اس ظلمت کدۂ خراب میں کیونکر تشریف لاسکتا ہے اور آج جب وہ اپنی مانوس دنیا کی طرف چند لمحے کیلئے واپس تشریف لے گئے تو بنی نوع انسان کے یہ نادان افراد حیرت سے واقعہ کا ہی انکار کر رہے ہیں۔ حالاں کہ دونوں جہان اس واقعہ پر گواہ ہیں۔ محمد ﷺ کی یہ شان بھی عجیب ہے —— وہ یہاں آئیں تو فرشتوں کو حیرت —— اور یہاں سے جائیں تو

انسانوں کو حیرت ـــــ ان کی ذات حیرتوں کا مجموعہ ہے ــــ!"

دوسرے فرشتے نے جواب میں کہا:ـــــ

"دراصل حیرت تو ان انسانوں کی عقل پر ہے جو اُن کے یہاں آنے پر حیرت نہیں کرتے، جانے پر حیرت زدہ ہیں حالانکہ کسی کا اَپنے وطن میں ہونا باعث حیرت نہیں ہے۔ باعث حیرت غیر جگہ نظر آنا ہے"۔

جمال یار کی زیبائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیانی سے

علامہ ارشد القادری

زُلف وزنجیر کی کہانیاں

آرزوؤں کا انتخاب

مدینے کی وہ رات جس کی صبح کو معرکۂ بدر کیلئے روانگی تھی، عید کی شب سے کم نہیں تھی۔ آرزوؤں کی ترنگ میں روحیں اس طرح شرابور تھیں کہ ہر آنکھ سے کوثر کی شراب کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ رات کی تنہائی میں ایک جگہ بیٹھ کر دو سرفروش نوجوان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شائد طلوع ہونے والی صبح تمنا کی خوشی میں ان کی آنکھوں کی نیند اُڑ گئی تھی۔ عالم شوق کی سرمستی میں گفتگو اتنی والہانہ ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی پلکوں کا دامن بھیگ جاتا تھا۔

جذبات کے تلاطم میں بیخود ہو کر ایک ساتھی نے دوسرے سے کہا —— ''طلوع سحر میں اَب چند ہی گھڑیوں کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ محویت شوق کا یہ خموش عالم شائد پھر نہ مل سکے۔ اس لئے آؤ کل کے پیش آنے والے معرکۂ جنگ کیلئے اَپنے رب کے حضور میں اپنی سب سے محبوب آرزو کی دعا مانگی جائے''۔

یہ سنتے ہی فرطِ مسرّت سے دوسرے ساتھی کا چہرہ کھل اُٹھا۔ والہانہ جذبۂ شوق میں اس پیش کش کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواب دیا: ——

''نہال آرزو کی شادابی کیلئے اس سے زیادہ کیف بار لمحہ اور کیا مل سکتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو، تمہاری دُعا پر میں آمین کہوں گا''۔

اَب دِل کا عالم قابو سے باہر ہو چلا تھا۔ روح کی گہرائی سے لے کر پلکوں کی چلمن تک ساری ہستی ایک پُرسوز کیف میں ڈوب گئی تھی —— ہاتھ اُٹھتے ہی دُعا کے یہ الفاظ رات کی

خاموش فضا میں بکھر گئے:۔۔۔۔

''خداوندا! کل میدانِ جنگ میں دشمن کا سب سے بڑا سورما اور جنگ آزمودہ بہادر میرے مقابلے پر آئے میں اس پر شیر کی طرح ٹوٹ پڑوں پہلی ہی ضرب میں اس کی تلوار کی دھار موڑ دوں، اس کے نیزے کے ٹکڑے اڑا دوں، اور اپنی نوک شمشیر اس کے سینے میں پیوست کر کے اسے زمین پر تڑپتا ہوا دیکھوں ٹھیک اس وقت جبکہ وہ شدّت کرب سے وہ چیخ رہا ہو۔ میں اس کے قریب جا کر آواز دوں کہ آج تیرے کفر کا غرور ٹوٹ گیا۔ جس خدا کی غیبی قدرتوں کا تو نے مذاق اڑایا تھا دیکھ آج اس نے بادلوں کی اوٹ سے اپنے جلال و جبروت کا لشکر اتار دیا ہے۔ آج اس کے پیغمبر کی فیروزمندیوں کے ظہور کا دن ہے۔

پھر اس کا سر قلم کر کے ہمیشہ کیلئے ذلتوں کی خاک پر روندے جانے کیلئے پھینک دوں''۔

اَب دوسرے ساتھی نے اَپنی دعا کا آغاز یوں کیا:۔۔۔۔

''الٰہ العالمین! میری آرزو یہ ہے کہ کل کے پیش آنے والے معرکۂ جنگ میں میرا مقابلہ دشمن کے کسی جیوٹ اور دلیر سپاہی سے ہو۔ وہ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میرے مقابلے پر آئے۔ شوقِ شہادت میں مدہوش ہو کر میں اس کی طرف بڑھوں۔ وہ میرے اوپر حملہ کرے۔ میں اس کے اُوپر وار کروں۔ لڑتے لڑتے میں گھائل ہو جاؤں۔ میرا سارا جسم زخموں سے چُور ہو جائے۔ اسلام کا عشق میری رگوں سے خون کی ایک ایک بوند کا خراج وصول کرے۔ یہاں تک کہ میں بیتاب ہو کر زمین پر گر پڑوں۔ دشمن میرے سینے پر سوار ہو کر میرا سر قلم کر لے۔ میری ناک کاٹ لے، میری آنکھیں نکال لے، میرے چہرے کی ہیئت بگاڑ دے، میرے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے۔

اس کے بعد میں اس حال میں تیرے سامنے پیش کیا جاؤں کہ میری ناک کٹی ہوئی ہو، آنکھیں نکال لی گئی ہوں، کان جدا کر دیئے گئے ہوں، زخموں کے نشانات سے چہرے کی ہیئت بگاڑ دی گئی ہو، پھر سَر سے پا تک خون میں نہائے ہوئے اَپنے ایک مسکین بندے کو اس حال میں دیکھ کر تو دریافت کرے۔

یہ تُو نے اَپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ میری دی ہوئی آنکھیں کیا ہوئیں، کان اور ناک

کہاں پھنک آئے۔ تیرا خوبصورت چہرہ کیسے بگڑ گیا۔

پھر میں جواب عرض کروں:

رَبّ العزّت! تیرے اور تیرے محبوب کی خوشنودی کیلئے یہ سب کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ صرف اس تمنا میں میرا یہ حال ہوا کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے حبیب کو میں راضی کرلوں"۔

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دونوں وارفتہ حالوں کی پُر سوز دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبول ہوگئیں۔ دوسرے دن میدان جنگ میں دونوں کے ساتھ وہی حالات پیش آئے جو اپنے رب کے حضور میں انہوں نے بطور دعا مانگی تھیں۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ دشمن پر فتح پانے کی دعا تو سبھی مانگتے ہیں لیکن اپنی ہستی کو دشمن کے حوالے کر دینے کی دُعا تو ایک دم نرالی ہے—— ایسی آرزو اسی کے سینے میں مچل سکتی ہے جس نے شہیدوں کی زندگی کا عروج ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ اور جس کی نگاہ میں مدنی محبوب کا ایک جاں نواز تبسم ساری متاع زندگی پر حاوی ہو گیا ہو۔

جلوؤں کی وادی

مکّے سے چند میل کے فاصلے پر حُدَیْبِیَہ نام کی وادی تاریخی عظمتوں کی ایک بہت بڑی جلوہ گاہ ہے۔ عشق و ایمان کی بہت سی جاں فروز کہانیاں اس کے دامن سے وابستہ ہیں۔

کہتے ہیں کہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم ۶ ہجری میں اپنے پندرہ سو جاں نثاروں کے ساتھ طواف کعبہ کی نیت سے مکّہ کیلئے روانہ ہوئے۔ جب مکّہ چند میل رہ گیا تو حدیبیہ نام کی ایک وادی میں قافلے کے ٹھہرنے کا حکم صادر فرمایا۔ وہیں پر یہ خبر موصول ہوئی کہ کفار مکّہ نے طے کرلیا ہے کہ وہ شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

یہ اطلاع پانے کے بعد سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ مکّہ والوں سے جا کر کہیں کہ ہم لوگ جنگ کی نیت سے نہیں آئے صرف عمرہ کر کے یعنی صفا و مروہ کی سعی اور خانۂ کعبہ کا طواف کر کے لوٹ جائیں گے۔ بے خطر وہ ہمیں حرم میں آنے کی

اجازت دیں۔

سرکار کا یہ پیغام لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکّے کیلئے روانہ ہو گئے۔ شہر پہنچ کر انہوں نے سردارانِ مکّہ سے ملاقات کی اور انہیں ساری تفصیل بتائی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

ابھی حضرت عثمان مکّے ہی میں تھے کہ کسی نے قافلے میں یہ خبر اُڑا دی کہ حضرت عثمان کو کفارِ مکّہ نے شہید کر دیا۔ اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی صحابۂ کرام میں سخت اضطراب و ہیجان برپا ہو گیا۔ صحابۂ کرام کی بیتابی دیکھ کر سرکار نے ایک درخت کے نیچے سب کو جمع کیا۔ اور اس بات پر ایک ایک شخص سے عہد لیا کہ اگر یہ خبر صحیح ہوئی تو خونِ عثمان کا انتقام لینے کیلئے جان تک کی بازی لگا دی جائے گی۔

● ویسے سرکار سے یہ حقیقت مخفی نہیں تھی کہ یہ خبر غلط ہے اور حضرت عثمان زندہ و سلامت ہیں جیسا کہ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ سرکار کے ہاتھ پر جب سب لوگ بیعت کر چکے تو اخیر میں حضور نے اپنے ایک دستِ کریم کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیا اور اپنے دوسرے ہاتھ پر اُن کا ہاتھ رکھ کر ان کی طرف سے بھی بیعت لی ـــــ اگر حضور کے علم میں وہ زندہ نہ ہوتے تو ہرگز انہیں بیعت میں شریک نہ فرمایا جاتا کیونکہ وفات یافتہ آدمی سے کسی معاہدہ پر اقرار لینا قطعاً بے معنیٰ ہے۔

اسی موقع پر بعض صحابۂ کرام نے نہایت حسرت کے ساتھ یہ کہا کہ حضرت عثمان ہم سے پہلے مکّہ پہنچ گئے۔ یقیناً انہوں نے خانۂ کعبہ کا طواف کر لیا ہو گا۔ حضورِ انور کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عثمان بغیر ہمارے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کریں گے۔

صحابہ نے پھر دریافت کیا کہ آخر کون سی چیز انہیں طواف سے مانع ہو گی جبکہ وہ حرم میں داخل ہو گئے ہیں۔ حضور نے جواب دیا۔ ان کا جذبۂ اخلاص کبھی انہیں اجازت نہیں دے گا کہ وہ بغیر ہمارے طواف کر لیں۔ چنانچہ جب حضرت عثمان واپس لوٹے تو صحابہ نے اُن سے کہا کہ آپ نے تو خدا کے گھر کا طواف کر لیا ہو گا۔ یہ سُن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

عشق و ایمان کا جذبۂ اخلاص انگ انگ سے پھوٹ پڑا۔ بپھرے ہوئے جذبات میں یہ جواب دیا:——

"میرے ساتھ اس سے زیادہ سخت بدگمانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں بغیر رسول اللہ ﷺ کے خدا کے گھر کا طواف کرلیتا۔ خدا کا گھر تو پہلے سے موجود تھا لیکن گھر کی چوکھٹ پر رہتے ہوئے بھی گھر والے سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ عرفان خداوندی کا یہ سارا تقرب تو رسول ہی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اُنہی کے دم قدم سے خدا کے ساتھ ہماری روحوں کا سررشتہ وجود میں آیا ہے۔ بھلا میں اُنہیں چھوڑ کر کس مُنہ سے دربار خداوندی کا رُخ کرتا۔

قسم خدا کی ایک سال بھی اگر مجھے انتظار کرنا پڑتا تو میں اَپنے رسول کے انتظار میں ایک سال تک خانۂ کعبہ کا طواف ملتوی رکھتا۔ قریش کے سرداروں نے بار بار مجھے اصرار کیا کہ میں خانۂ کعبہ تک آگیا ہوں تو طواف کرلوں۔ لیکن مَیں نے ہر بار انکار کیا کہ اپنے رسول کے بغیر ہرگز طواف نہیں کروں گا—— چاہے خانۂ کعبہ میرے پیش نظر ہی کیوں نہ ہو"۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس جواب نے خانہ خدا اور حبیب خدا کا فرق اتنا واضح کردیا ہے کہ مظاہر خداوندی میں رسول کی حیثیت سمجھنے کیلئے اب فکر ونظر کا کوئی حجاب باقی نہیں رہا۔ اَب یہ راز پوری طرح واشگاف ہوگیا۔ کہ خدا شناسی کی منزل میں رسول عربی ﷺ کا مقام عرفان کیا ہے؟ پھر حضرت عثمان کا یہ مشرب کچھ ان کی ذات کے ساتھ خاص نہیں تھا، سرکار نے یہ وجہ بتا کر کہ اُن کا جذبۂ اخلاص کبھی اجازت نہیں دے گا کہ وہ میرے بغیر طواف کر لیں—— واضح کردیا کہ عشق و ایمان کا مزاج ہی یہی ہے۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ و صَحبہ و بارك وَسلّم ط

اسی وادی میں عقیدت وعشق کا ایک اَور نہایت رقت انگیز واقعہ پیش آیا۔ سہیل بن عمرو قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی۔ جب باتیں طے پاگئیں تو اب انہیں قید تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

سرکار نے حضرت مولا علی رضی اللہ عنہ کو صلح نامہ کی عبارت لکھنے کیلئے بلایا۔ وہ کاغذ اور قلم

لے کر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ کے بعد حضور نے صلحنامہ کی عبارت کا یوں افتتاح کیا:——

هٰذا ما صالح علیه محمد رسول اللّٰه —— یہ وہ نکات ہیں جن پر محمد رسول اللہ نے مصالحت فرمائی۔ اتنا ہی فقرہ حضرت علی لکھنے پائے تھے کہ سہیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"یہ کاغذ ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔ اس پر کوئی ایسی عبارت نہیں لکھی جا سکتی جس سے فریقین میں سے کسی کو اختلاف ہو۔ ہم آپ کو اگر رسول اللہ ہی تسلیم کر لیتے تو اس مصالحت کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔ اس لئے آپ معاہدے کی عبارت سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیجئے اور اس کی جگہ ابن عبداللہ لکھوایئے"۔

حضور نے یہ سوچ کر کہ مصالحت میں کوئی رخنہ نہ واقع ہو حضرت علی کو حکم دیا کہ

"رسول اللہ کا لفظ مٹا دو اور اس کے بجائے ابن عبداللہ لکھ دو"۔

بارگاہِ رسالت میں حضرت علی کا جذبۂ اطاعت شعاری محتاج بیان نہیں ہے۔ مقام صہبا میں آپ کا یہ واقعہ ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ نے سرکار کے خواب ناز پر اپنی نماز جیسی متاع گرانمایہ کو نثار کر دیا تھا جبکہ حضور آپ کے زانوئے اطہر پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ جس کے احساسِ ادب کی نزاکتوں کا یہ عالم ہو کہ کچی نیند محبوب کا اٹھ جانا بھی اسے گوارا نہ ہو اس کے دل نیاز مند کی فدا کاریوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے —— لیکن حدیبیہ کے چشم دید گواہوں کی زبانی یہ معلوم کر کے سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے کہ اُنہی حضرت علی کو جب حضور نے یہ حکم صادر فرمایا کہ رَسُولُ اللہ کا لفظ مٹا دو تو اُن کا جذبۂ عقیدت اس حکم کی تاب نہ لا سکا۔ فرطِ الم سے دل کو ایسی ٹھیس لگی کہ جذبات قابو سے باہر ہو گئے:

ایک ٹوٹ جانے والے گھائل کی طرح مچلتے ہوئے انہوں نے جواب دیا:——

وَاللّٰهِ لَنْ اَمْحُوكَ اَبَدًا —— قسم خدا کی میں ہرگز آپ کو نہیں مٹاؤں گا۔ مقام صلح و انکسار میں حضور اسے گوارا کر لیں تو کر لیں لیکن گدایانِ عشق اِسے اپنے جذبۂ ایمان کی توہین سمجھتے ہیں۔ نقش قدم پر مر مٹنے والے یہ سننے کی بھی تاب نہیں رکھتے کہ محبوب کے اسم اعظم کا نقش مٹا دیا جائے۔

سہیل بن عمرو کے اصرار پر جب حضور نے دوبارہ کہا تو غیرت جلال سے حضرت علی کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور حالت اضطراب میں وہ اپنی تیغ ذوالفقار کے قبضے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتے تھے کہ حضور نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اور خود ہی اَپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا کر اس کی جگہ "ابن عبداللہ" لکھ دیا۔

عقل انسانی اس مقام پر حیران و ششدر رہ گئی کہ وہ نبی امی جسے کبھی نوشت و خواند کا سَابقہ نہ پڑا ہو اس نے کیونکر ایک لفظ کو پڑھ کر مٹایا اور اس کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا۔

حضرت امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توجیہہ یوں فرمائی ہے کہ یہ سب کچھ معجزہ کے طور پر حضور سے صادر ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ انداز جواب منزل عشق و عرفان کے مسافروں کے لئے ایک بہترین مشعل ہے اس کی روشنی میں ہمیں اس حقیقت کا سراغ آسانی سے مل جاتا ہے کہ مدنی سرکار مقام انکسار میں اَپنے لئے جو بات پسند فرمائیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی اَپنے سرکار کیلئے اسی رُخ پر سوچیں۔ یہ ان کا مقام تواضع ہے کہ اَپنے خاک نشینوں سے ملنے کیلئے وہ فرازِ عرش سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ لیکن ہمارا منصب غلامی ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے یہ تو سر تا سر ہمارے ہی محسوس کرنے کی چیز ہے۔

پس سرکار کے تواضع پسند ارشادات کو بنیاد بنا کر جو لوگ حضور کی حقیقی عظمتوں کا انکار کر بیٹھتے ہیں یا حضور کے ساتھ اپنی ہمسری کا خواب دیکھنے لگتے ہیں انہیں حضرت مولائے کائنات سیّدنا علی مرتضٰی رضی اللہ تعالٰی عنہ کے اس طرزِ عمل میں اسلام و ایمان کا مزاج سمجھنے کیلئے بہت واضح اشارات ہیں۔

عشقِ و اخلاص کی ارجمندی

کہتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر "اسود راعی" نام کا ایک شخص تھا یہ ایک حبشی غلام تھا جو یہودیوں کے مویشی چرایا کرتا تھا صحرا سے اس قدر مانوس تھا کہ اَپنے وقت کا اکثر حصہ وہیں گذارتا تھا۔ ایک دن شام کو پلٹ کر آبادی میں آیا تو دیکھا کہ سارے یہودی جنگ کی

تیاریوں میں مصروف ہیں۔ تلواروں پر پانی چڑھایا جا رہا ہے، نیزے اور تیروں کی نوکیں صیقل کی جا رہی ہیں جگہ جگہ سپاہیوں کی قطار کھڑی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے تعجبانہ لہجے میں دریافت کیا:۔۔۔

''یہ کس سے جنگ کی تیار ہو رہی ہے؟''

یہودی نے جواب دیا:۔۔۔

''کیا تمہیں نہیں معلوم؟ کہ عرب کے نخلستان میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو نبوّت کا مدعی ہے۔ اُپنے ساتھی دیوانوں کی ایک فوج لے کر وہ فلاں مقام پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم مقابلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ امروز فردا میں اس کی فوجیں ہمارے قلعہ کی فصیل تک پہنچنے والی ہیں''۔

یہ جواب سن کر چرواہے کے لاشعور میں اچانک جستجوئے شوق کا ایک چراغ جل اُٹھا اور وہ حقیقت سے قریب ہو کر سوچنے لگا:۔۔۔

''بلا وجہ کوئی دیوانہ نہیں ہوتا وہ بھی دیوانوں کی ایک فوج جو جان دینے کیلئے ساتھ آئی ہے۔ یہ بادۂ فریب کی متوالی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ کشش صرف جمالِ حق کی ہے۔ ہو نہ ہو انہوں نے سچائی کا بے نقاب چہرہ دیکھ لیا ہے''۔

یہ سوچتے سوچتے دفعتاً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی:۔۔۔''یقیناً وہ ایک سچا پیغمبر ہے'' یہ کہتے ہوئے اُٹھا اور بکریوں کو ساتھ لئے ہوئے بیخودی کے عالم میں ایک طرف چل پڑا۔

بالآخر وہ سراغ لگاتے لگاتے مدنی سرکار کے لشکر میں پہنچ گیا۔

حضور کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس نے پہلا سوال یہ کیا:۔۔۔

''آپ کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟''

حضور نے اس کے دل کے کشور کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا:۔۔۔

''اس بات کی کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اس نے اپنے بندوں کی ہدایت کیلئے نبیوں اور رسولوں کا ایک طویل سلسلہ دنیا میں قائم فرمایا جس کی آخری کڑی میں ہوں''۔

اس نے پھر دریافت کیا:——

"اگر میں خدائے ذوالجلال پر ایمان لاؤں اور آپ کی نبوت کا اقرار کرلوں تو اس کا صلہ کیا ملے گا؟"

فرمایا:——"عالمِ آخرت کی دائمی آسائش"۔

پھر اس نے جذبۂ شوق میں بے قابو ہوکر تیسرا سوال کیا:

"یا رسول اللہ! میں حبشی نژاد ہوں۔ میرے جسم کا رنگ سیاہ ہے۔ میرا چہرہ نہایت بدشکل ہے۔ میں ایک صحرانورد چرواہا ہوں۔ میرے بدن سے پسینے کی بدبو نکلتی ہے۔ اگر میں بھی آپ کے دیوانوں کی فوج میں شامل ہوکر راہِ خدا میں قتل کردیا جاؤں تو کیا مجھے بھی جنت میں داخلے کی اجازت مل سکے گی"۔

ارشاد فرمایا:"ضرور ملے گی"

یہ سنتے ہی وہ بیخود ہوگیا اور اسی عالم میں کلمہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس کے بعد حضور سے اس نے بکریوں کی بابت دریافت کیا۔

ارشاد فرمایا:——

"دوسرے کی چیز ہمارے لئے حلال نہیں ہے۔ انہیں قلعہ کی طرف لے جاؤ اور کنکر مار کر ہنکادو یہ سب اُپنے اُپنے مالک کے پاس چلی جائیں گی"۔

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ولولۂ شہادت کے ہیجان سے اسے ایک لمحہ قرار نہیں تھا فوراً اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا اور مجاہدینِ اسلام کی صفوں میں شامل ہوگیا۔

واقعات کے راوی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے دن جب میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی قطار کھڑی ہوئی تو جذبۂ شوق کا اضطراب اس کے سیاہ چہرے سے شبنم کے سفید قطروں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ طبلِ جنگ بجتے ہی اس کے ضبط و شکیب کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ایک بیتاب دیوانے کی طرح دشمنوں کی یلغار میں کود پڑا۔

اس کے سیاہ ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلوار کا منظر ایسا دلکشا معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں

میں بجلی تڑپ رہی ہو۔

کہتے ہیں کہ نہایت بے جگری کے ساتھ اس نے دشمن کا مقابلہ کیا۔ زخموں سے سارا جسم لہولہان ہو گیا تھا۔ لیکن شوقِ شہادت کے نشے میں وہ دشمن کی طرف بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ چاروں طرف سے اس پر تلواریں ٹوٹ پڑیں۔ اَب وہ نیم جان ہو کر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ گھائل جسم میں اس کی روح مچل رہی تھی کہ اَب جنّت کا فاصلہ بہت قریب رہ گیا تھا۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب اس کی نعش حضور کے سامنے لائی گئی تو اس کے فیروز بخت انجام پر سرکار کی پلکیں بھیگ گئیں۔

فرمایا:—— اسے جنّت کی نہرِ حیات میں غوطہ دیا گیا۔ اَب اس کے چہرے کی چاندنی سے فردوس کے بام و در جگمگا اٹھے ہیں۔ اس کے پسینے کی خوشبو میں حورانِ بہشتی اپنے آنچل بسا رہی ہیں۔ جنت کی دو حسین حوریں اُسے اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے باغِ خُلد کی سیر کرا رہی ہیں—— سبحان اللہ!

سرکار کے اس بیان پر بہت سے صحابہ کے قلوب رشک سے مچل گئے۔ اس کی فیروز بختی پر سب محوِ حیرت تھے کہ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے اور کوئی عملِ خیر نہیں کیا تھا۔ اس کے نامۂ عمل میں نہ ایک وقت کی نماز تھی، نہ ایک سجدہ تھا۔ سفید و شفاف کفن کی طرح زندگی کا سادہ ورق لئے ہوئے گیا اور بڑے بڑے زاہدانِ شب زندہ دار کو اَپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

سچ کہا ہے عارفانِ طریقت نے کہ عشق و اخلاص کی ایک جنون انگیز ادا ہزار برس کی بے ریا عبادتوں اور حسنات کے بے شمار ذخیروں پر بھاری ہے یہی وہ سکۂ رائج الوقت ہے جس میں آج تک کہیں بھی کھوٹ نہیں نکلا اور کسی عالم میں بھی اس کے نرخ کی سطح نیچے نہیں اتری جذبہ عشق کی ایک ہی جست نے عالمِ اسفل کے خاک زادوں کو بامِ عرش تک پہنچا دیا اور محبت ہی کا گداز تھا جس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر اَپنی شوکتوں کے پرچم اُڑوائے اور روئے زمین کی بڑی سے بڑی عظمت کو اَپنے قدموں کے نیچے روندوا ڈالا۔

علامہ ارشد القادری

بیوہ عورت

عشقِ واخلاص کا ایک دردانگیز واقعہ

چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا۔ مدینے کی گلیوں میں ہر طرف نور برس رہا تھا۔ پوری آبادی رحمتوں کی گود میں محوِ خواب تھی۔ آسمانوں کے دریچے کھل گئے تھے۔ فضائے بسیط میں فرشتوں کے پَروں کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عالم بالا کا یہ کارواں شاید مدینے کی زمین کا تقدس چُومنے آ رہا تھا۔

اچانک اسی خاموش سناٹے میں بہت دُور ایک آواز گونجی۔ فضاؤں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ شبستان وجود کے سارے تار بکھر گئے اور ایمان کی تپش چنگاریوں کی طرح بال بال سے پھوٹنے لگی۔

میخانۂ عشق کا دروازہ کھلا۔ کوثر کی شراب چھلکی، اور جذبۂ اخلاص کی والہانہ سرمستیوں میں سارا ماحول ڈوب گیا۔

یہ غلامانِ اسلام کے آقا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز تھی۔ جس نے ہر گھر میں ایک ہنگامۂ شوق برپا کر دیا تھا۔

اَب مدینے کی ساری آبادی جاگ اٹھی تھی۔

سرورِ کونین کا منادی ایک شکستہ گھر کے سامنے آواز دے رہا تھا۔

گلشنِ اسلام کی شادابی کیلئے خون کی ضرورت ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مجاہدین کا لشکر ایک عظیم مہم پر روانہ ہو رہا ہے۔ مدینے کی ارجمند مائیں اپنے نوجوان شہزادوں کا نذرانہ لے کر فوراً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو جائیں۔

کلمۂ حق کی برتری کیلئے تڑپتی ہوئی لاشوں کو خوشنودیٔ حق کی بشارت مبارک ہو مبارک ہو خون کا وہ آخری قطرہ جو ٹپکتے ہی اسلام کی بنیاد میں جذب ہو جائے‘‘۔

ایک ٹوٹے ہوئے دل کی طرح یہ ٹوٹا ہوا گھر ایک بیوہ عورت کا تھا۔ چھ سال کے یتیم بچے کو گود میں لئے ہوئے وہ سو رہی تھی۔ حضرت بلال کی آواز سن کر چونک پڑی دروازے پر کھڑی ہر کر پھر غور سے سُنا۔

سُنتے ہی دل کی چوٹ اُبھر آئی، آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو گئیں۔ چھ سال کا یتیم بچہ سویا ہوا تھا۔ ماں رو رہی تھی۔ فرطِ محبت میں بچّے کو سینے سے چمٹا لیا۔ سسکیوں کی آواز سن کر بچّے نے آنکھیں کھول دیں، ماں کو روتا ہوا دیکھ کر بیتاب ہو گیا۔

گلے میں باہیں ڈال کر معصوم اداؤں کے ساتھ دریافت کیا:——

’’ماں! کیوں رو رہی ہے؟ کہاں تکلیف ہے تمہیں؟‘‘

آہ! ایک ناسمجھ بچّے کو کیا معلوم؟ کہ حسرتوں کی چوٹ کتنی دردناک ہوتی ہے؟ کہاں چوٹ ہے؟ یہ نہیں بتایا جا سکتا لیکن اس کی کسک سے سارا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔

پھر ایک بیوہ عورت کا دل تو اتنا نازک ہوتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے۔ بچے کے اس سوال پر ماں کا دل اور بھر آیا۔ غم کی چوٹ سے یک بیک جذبات کا دھارا پھوٹ پڑا۔ گرم گرم آنسوؤں سے آنچل کا کونہ بھیگ گیا۔

بچہ بھی ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔

ماں نے بچے کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:——

’’میرے لال مت روؤ یتیموں کا رونا عرش کا دل ہلا دیتا ہے۔ تمہارے گریہ درد سے غم کی چوٹ اور تازہ ہو جائے گی۔ بدر کی وادی میں ابدی نیند سونے والے اُپنے شہید باپ کی روح کو مت تڑپاؤ۔ دنیا چھوڑنے کے بعد بھی شہیدوں کے دل کا رابطہ اُپنے خون کے رشتوں سے باقی رہتا ہے۔ چپ ہو جاؤ! مت روؤ میرے لال!‘‘

مگر بچہ روتا رہا۔ وہ بضد تھا کہ ماں کیوں رو رہی ہے۔ بالآخر اُپنے بچّے کیلئے ماں کی

آنکھ کا اُبلتا ہوا چشمہ سوکھ گیا۔

ماں نے بچّے کو تسلّی دیتے ہوئے کہا:—— ''بیٹا! ابھی ابھی حضرت بلال، وہی بلال جنہیں ہم دہکتی ہوئی آگ کا نکھرا ہوا سونا کہتے ہیں، یہ اعلان کرتے ہوئے گذرے ہیں کہ اسلام کا پرچم دشمنوں کی زد پر ہے۔ آج نمازِ فجر کے بعد مجاہدین کا ایک لشکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہا ہے آقائے کونین نے اپنے جاں باز وفاداروں کو آواز دی۔ آج غیرتِ حق کا سمندر ہلکورے لے رہا ہے۔

رحمتوں کے تاجدار آج ایک ایک قطرۂ خون پر جنتوں کی بہار لٹا دیں گے۔ ایک لمحے میں آج قسمتوں کی ساری شکن مٹ جائے گی۔

کتنی خوش نصیب ہو گی وہ مادران ملّت جو سپیدۂ سحر کی روشنی میں اپنے نوجوان شہزادوں کا نذرانہ لئے ہوئے سرکارِ رسالت میں حاضر ہوں گی!

آہ! کتنی قابلِ رشک ہوگی ان کی یہ التجا کہ یارسول اللہ! ہم اپنے جگر کے ٹکڑے آپ کے قدموں پر نثار کرنے لائی ہیں۔ اسی آرزو میں ان کو دودھ پلا پلا کر جوان کیا تھا کہ ایک دن ان کے لہو سے دین کا چمن سیراب ہوگا۔

یارسول اللہ! ہمارے ارمانوں کی یہ حقیر قربانی قبول فرمالیں۔ سرکار! عمر بھر کی محنت وصول ہو جائے گی''۔

یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آواز بھرا گئی۔ بچہ ماں کو روتا دیکھ کر پھر مچل گیا۔ ماں نے کہا—— ''بیٹا ضد نہ کرو۔ دل کی چوٹ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں—— کاش! آج میری گود میں بھی کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں بھی اپنا نذرانۂ شوق لئے رحمتِ عالم کی بارگاہ میں حاضر ہوتی۔

افسوس کہ آج آخرت کے سب سے بڑے اعزاز سے میں محروم ہو گئی''۔

یہ کہتے کہتے پھر دل کا درد جاگ اٹھا۔ پھر غم کی تپش بڑھ گئی اور پھر آنکھوں کے چشمے سے آنسو اُبلنے لگے۔

بچّے نے ماں کو چُپ کراتے ہوئے کہا—— ''اس میں رونے کی کیا بات ہے ماں!

تمہاری گود تو خالی نہیں ہے۔ رحمتِ عالم کے حضور میں سب اُپنے جوان بیٹوں کو لے کر جائیں گے۔ تم مجھی کو لے کر چلو"۔

ماں نے پیکارتے ہوئے جواب دیا ــــ "بیٹا! میدانِ کارزار میں بچوں کو نہیں لے جاتے وہاں تو شمشیر کی نوک سے دشمن کی صفیں الٹنے کیلئے جوانوں کے کس بل کی ضرورت پڑتی ہے جہاں سروں پر چمکتی ہوئی تلواروں کی بجلیاں گرتی ہیں ــــ وہاں نیزوں کی انی سے کفر کے جگر میں شگاف ڈالا جاتا ہے ــــ میرے لال! وہ قتل و خون کی سرزمین ہے، تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

بچے نے ضد کرتے ہوئے کہا ــــ "یہ ٹھیک ہے کہ اپنی کمسنی کے باعث ہم میدان کارزار میں جانے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن بارگاہِ رسالت میں حاضری کیلئے تو عمر کی کوئی قید نہیں ہے ــــ ہماری قربانی سرکار نے قبول فرمالی تو زہے نصیب! اور اگر بچہ سمجھ کر واپس کر دیا تو کم از کم اس کا تو غم نہیں رہے گا کہ اسلام کیلئے جان کی نذر پیش کرنے سے ہم محروم رہ گئے۔ جان چھوٹی ہو یا بڑی۔ بہر حال جان ہے اور جان ہونے کی حیثیت سے دونوں کی قیمت میں کوئی فرق نہیں ماں!

ماں نے فرطِ محبت میں بچے کا منہ چوم لیا۔ اور حیرت سے منہ تکنے لگی کہ اس کمسنی میں داناؤں جیسا شعور صرف اس رحمت خاص کا صدقہ ہے جو یتیموں کی نگراں ہے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، جلوۂ زیبا کے پروانے آنکھوں میں خمارِ شوق لئے مسجد نبوی کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ دردآشنا دلوں کیلئے ایک رات کا لمحۂ فراق بھی طویل مدت کی طرح بوجھل ہو گیا تھا۔ حجرۂ عائشہ کے خورشید کی پہلی کرن کے نظارہ کیلئے ہر نگاہ اشتیاق آرزو کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

نمازِ فجر کے بعد مسجد نبوی کے میدان میں مجاہدین کی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ جو نوجوان محاذ جنگ پر جانے کے قابل تھے، انہیں لے لیا۔ باقی واپس کر دیئے گئے۔ انتخاب کے کام سے فارغ ہو کر سرکار واپس تشریف لا ہی رہے تھے کہ ایک پردہ نشیں خاتون پر نظر پڑی جو چھ سال کا ایک بچہ لئے کنارے کھڑی تھی۔

سرکار نے حضرتِ بلال سے ارشاد فرمایا:——
"اس خاتون سے جا کر دریافت کرو، وہ بارگاہِ رحمت میں کیا فریاد لے کر آئی ہے؟"
حضرت بلال نے قریب جا کر نہایت ادب سے پوچھا:——
"دربارِ رسالت میں آپ کیا فریاد لے کر حاضر ہوئی ہیں؟"
خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا:——
"آج پچھلے پہر آپ اعلان کرتے ہوئے میرے گھر کے سامنے سے گذرے اعلان سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میرے گھر میں کوئی جوان نہیں تھا جس کے خون کی اسلام کی بارگاہ میں نذر پیش کرتی۔ چھ سال کا یہ یتیم بچہ ہے، جس کا باپ گذشتہ سال جنگ بدر میں جام شہادت سے سیراب ہوا۔ یہی کل میری متاع زندگی ہے، جسے سرکار کے قدموں پر نثار کرنے لائی ہوں"۔
حضرت بلال نے بچے کو گود میں اٹھالیا اور سرکار کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ سرکار نے بچے کو آغوش رحمت میں جگہ دی۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ پیار کیا۔ اور نہایت شفقت کے ساتھ ارشاد فرمایا:——

"میری رحمتوں کے محبوب شہزادے! تم ابھی کمسن ہو۔ محاذ جنگ پر جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابھی تم اپنی ماں کی آغوش میں پلو، بڑھو اور گلشن اسلام کی بہار بنو۔ جب تمہارے بازوؤں میں کس بل پیدا ہو جائے گا تو میدانِ جنگ تمہیں خود آواز دے گا"۔

بچے نے اپنی تتلائی ہوئی زبان میں کہا:——

"یارسول اللہ! میں نے اپنی امی جان کو دیکھا ہے کہ جب وہ چولہا جلاتی ہیں تو پہلے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو سلگاتی ہیں۔ جب آگ دہکنے لگتی ہے تو پھر موٹی موٹی لکڑیاں ڈالتی ہیں۔

یارسول اللہ! میں جنگ کرنے کے قابل تو نہیں لیکن کیا میدان کارزار گرم کرنے کیلئے مجھ سے تنکوں کا کام بھی نہیں لیا جا سکتا۔ اگر آپ مجھے اپنے ہمراہ نہیں لے گئے تو میری امی

روتے روتے ہلکان ہو جائیں گی ——— وہ اس غم میں ہر وقت روتی رہتی ہیں کہ آج میری گود میں بھی کوئی جوان بیٹا ہوتا تو میں بھی اسے اسلام کی نظر کر کے سرکار کی خوشنودی کا اعزاز حاصل کرتی"۔

جن معصوم اداؤں کے ساتھ بچّے نے اپنی زبان میں دل کے حوصلوں کا اظہار کیا۔ سارے مجمع پر رقت طاری وہ گئی۔ سرکار بھی فرطِ اثر سے آبدیدہ ہو گئے۔

حضرت بلال سے فرمایا:۔

"جا کر اس بچّے کی ماں سے کہہ دو کہ اس کی ننھی قربانی قبول کر لی گئی۔ قیامت کے دن وہ غازیانِ اسلام کی ماؤں کی صفوں میں اٹھائی جائے گی۔

آج سے خدا کی ایک مقدّس امانت سمجھ کر وہ بچّے کی پرورش کا فرض انجام دے گی۔ خدا کے یہاں بال بال کا اجر محفوظ رہے گا"۔

علاّمہ ارشد القادری

اِنتخاب واقتباس

ذیل میں مشائخ اسلام اور ائمہ سلک کی مستند اور نایاب کتابوں سے مختلف موضوعات پر نہایت مفید انتخابات اُردو میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ارشد القادری

المنقذ من الضلال

تصنیف حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

طریقہ اثبات نبوّت

مسئلہ نبوّت میں انسانی شکوک کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:

1- نبوّت کے امکان میں شک ہے۔

2- نبوّت کے موجود ہونے میں شک ہے۔

3- کسی فرد خاص کے متعلق شک ہے کہ وہ منصب نبوّت کا حامل ہے یا نہیں۔

پہلے شک کا جواب یہ ہے کہ نبوّت موجود ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز موجود ہو اس کے امکان میں شک نہیں ہوسکتا۔

اَب ہم سے یہ سوال کیا جائے گا کہ نبوّت کے موجود ہونے کا ہمارے پاس کیا ثبوت ہے؟ تو اس سلسلے میں ہم یہ کہیں گے کہ دنیا میں کچھ ایسی بھی معلومات ہیں جن کا وجود عقل محض کی دریافت سے بالاتر ہے۔ جیسے علم طب اور علم نجوم کہ ابتداً صرف عقل کے ذریعہ ان کا وجود متصوّر نہیں ہوسکتا لہٰذا ماننا ہوگا کہ ذریعۂ عقل کے علاوہ بھی معلومات کا ایک اور ذریعہ

اِنسانوں کو دیا گیا ہے۔ اسی ذریعہ کو ہم نبوّت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس کی بنیاد الہام اور وحی پر رکھی گئی ہے۔

اگر لوگوں کو خواب کے مفہوم کا ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوتا اور ان سے کہا جاتا کہ دنیا میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو ایک ایسے عالم سے اپنا رابطہ رکھتے ہیں جس سے دوسرے لوگ قطعاً نابلد ہیں تو انہیں یقین نہ آتا —— اسی عالم کو ہم عالم غیب سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی عالم نبوّت کے معلومات کا مرکز ہے۔

پس ایسی چیزوں کی دریافت جو مدرکات عقل سے خارج ہیں۔ نبوّت کے بہت سارے خواص میں سے ایک خاصہ ہے۔

ہم نے علم طب، علم نجوم اور خواب کی جو مثالیں دی ہیں ان سے کوئی اختلاف بھی کرے تو کم از کم اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک سارے انسانوں میں قدرِ مشترک کے طور پر ایک ایسے عالم کا تصوّر رہا ہے جو ہمارے ظاہری حواس سے روپوش ہے اور جس کی دریافت سے عقل کی قوّتِ ادراک بھی قاصر ہے۔

لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس عالم کا تصوّر انسانوں کو ان نفوس قدسیہ کے ذریعہ ہوا ہے جن کی معلومات کا ذریعہ الہام اور وحی ہے اور اسی کا نام نبوّت ہے۔

یہ دلیل اصل نبوّت کے وجود پر ایمان لانے کیلئے کافی ہے۔

اَب رہ گئی یہ بحث کہ کسی شخص خاص کے بارے میں شک ہے کہ وہ نبی ہے یا نبی تو اس شک کے ازالہ کی سب سے مؤثر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس شخص کے حالات وکوائف دریافت کیے جائیں۔

اس کے احوال کی معرفت یا تو خود اس کے مشاہدہ سے ہوسکتی ہے یا پھر متواتر سماعت کے ذریعہ۔ آج یہ دوسری ہی صورت ممکن ہے۔

مثال کے طور پر جب تم نبوّت کے معنی سمجھ کر قرآن اور احادیث میں نظر کرو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ ہمارے پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے سب سے اونچے

درجے پر فائز تھے۔

اور اس امر کی تائید اس طرح پر ہوگی کہ جب تم حضور انور ﷺ کی یہ حدیث پڑھو گے کہ عبادت و ریاضت سے دل کا تصفیہ ہو جاتا ہے اور تم اسے واقعات پر منطبق کرو گے تو دنیا میں روشن ضمیر اور پاک باطن انسانوں کا ایک طبقہ دیکھ کر تمہیں پیغمبر کی سچائی کا یقین ہو جائے گا۔

جب تم حضور اکرم ﷺ کے یہ اقوال پڑھو گے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ایسے علوم کا وارث بنا دیتا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا، جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس ظالم کو اسی کے سر پر مسلط کر دیتا ہے، جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھتا ہے کہ سوائے فکر مولیٰ کے اُسے اور کوئی فکر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا و آخرت کے تمام افکار سے نجات دے دیتا ہے۔

جب تم ان اقوال کا تجربہ کرنے کیلئے عمل کے میدان میں قدم آگے بڑھاؤ گے تو تمہیں فوراً محسوس ہو جائے گا کہ یہ اقوال صداقت و راستی کی برکتوں سے لبریز ہیں اور اِنسان کی فطرت اسی طرح واقع ہوئی ہے کہ قول کی سچائی رفتہ رفتہ قائل کی سچائی کا یقین دلا دیتی ہے۔

اگرچہ معجزات و خوارق عادات بھی نبی کی شناخت میں معاون ہوتے ہیں لیکن شناخت کا سب سے یقینی ذریعہ خود نبی کی وہ زندگی ہے جو لاکھوں زندگیوں کے درمیان ایک کھلا ہوا امتیاز رکھتی ہے۔ اس کی وہ محیر العقول تعلیمات ہیں جن کے نتائج کا سر رشتہ عالم حقیقت سے مربوط ہوتا ہے۔

ہم سارے جہان کے منکرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ انصافِ نظر کے ساتھ نبوت کی سچائی کو پرکھنا چاہیں تو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت عالی اور اُن کی گرانقدر تعلیمات کا کھلے دل سے مطالعہ فرمائیں اور اسی کے دوش بدوش ان لوگوں کی زندگیوں کا بھی مطالعہ کریں جنہوں نے اَپنے آپ کو پیغمبر ﷺ کے اقوال و احوال کے سانچے میں ڈھال لیا تھا —— ہر جگہ انہیں ایک بولتا ہوا امتیاز نظر آئے گا۔

دلائل نبوّت

(از: افادات حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

ایک اُمّی شخص جس نے نہ کہیں تعلیم حاصل کی، نہ کتابوں کا مطالعہ کیا، نہ اہل علم اور اصحاب فضل و کمال کی صحبت کا فیض حاصل کرنے کیلئے کسی مقام کا سفر کیا۔ بچپن سے لے کر یوم ظہور نبوّت تک ایک یتیم و مسکین کی حیثیت سے عرب کے بت پرستوں، جاہلوں، ظالموں، میخواروں، فتنہ پردازوں، خونخواروں، بد قماشوں، توہم پرستوں، بے حیاؤں اور غیر مہذب وحشیوں کے کاندھے سے کاندھا ملاتے ہوئے اپنی زندگی کی ایک ایک صبح و شام گذاری لیکن حیرت ہے کہ اس نے اپنے اس ماحول سے کچھ نہیں لیا جو انسان کے ڈھلنے کا سب سے پہلا سانچہ ہے۔ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب دیئے بغیر عقل انسانی کا قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا کہ انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے یا تو اپنے ماحول سے ملتا ہے یا پھر کتابوں کے مطالعہ سے، لیکن نہ اس نے اپنے ماحول سے کچھ لیا نہ کتابوں سے اس کا کوئی سابقہ پڑا تو بتایا جائے کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ آخر کہاں کا تھا ——— ؟

اپنے ماحول کا ہوتا تو اس سے ہم آہنگ ہوتا۔ کتابوں کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس کیلئے نوشت و خواند کی قید ضروری ہے۔

اس سوال کے جواب سے عہدہ برآ ہونے کیلئے سوا اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی تھا یہاں کا نہیں تھا۔ عالم غیب کا تھا۔ اس کے علم و احساس اور سیرت و تہذیب کا سرچشمہ فیضان الٰہی تھا۔

ایک نہایت ہی غلیظ ماحول میں سیرت و کردار کے تقدس کی انفرادیت ہی بجائے خود ایک حیرت خیز امر ہے چہ جائیکہ جملہ شعبہ ہائے زندگی میں ہدایت و اصلاح کا ایک بچا تلا

مجموعہ قوانین بھی ساتھ ہے۔ اسرار کائنات کے دریا بھی بہہ رہے ہیں۔ زمانۂ تاریخ کے ماقبل کے حقائق کے چہرے سے حجابات بھی اٹھائے جا رہے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آ رہی ہے کہ اس کے میکدے کا ایک ساغر ظاہر و باطن کے ہمہ گیر انقلاب کیلئے کافی ہے۔ یہ ساری چیزیں اس امر کا یقین دلانے کیلئے بہت کافی ہیں کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے اور اسی کی تائید و حمایت کے بل پر اس کی زندگی کی یہ ساری انفرادیت قائم ہے——

لیکن ہم یہ دیکھ کر اور بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ جہاں فہم و ادراک کی معنوی دنیا میں اس کی برتری کا سکہ چل رہا ہے وہاں وہ عالم محسوسات میں بھی فرماں روائی کے منصب پر ہے——

جہاں سے چاہتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے کائنات کے نظام طبعی میں تصرف کرتا رہتا ہے۔ انہی تصرفات کو ہم معجزات کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں، دلائل نبوّت کے ضمن میں ان معجزات کی ایک اجمالی فہرست ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:——

1- صنادید قریش کی درخواست پر چاند کے دو ٹکڑے کر دینا اَب تاریخ عالم کا ایک مشہور واقعہ بن چکا ہے۔ جسے محمد رسول اللہ ﷺ کے سوانح نگار بھی جانتے ہیں اور وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے——

2- چند کھجوروں، چند روٹیوں اور چند قطرہ ہائے آب کی قلّت کو اتنی عظیم الشان کثرت میں تبدیل کر دینا کہ ایک بہت بڑے لشکر، ایک بے پناہ جم غفیر اور ایک عظیم مجمع کیلئے کافی ہو جائے یہ منصب نبوّت ہی کا کرشمہ ہے——

3- جنگ بدر میں ایک مُشت غبار کا طوفان بن جانا اور لشکر اعداء کو اُڑا لے جانا یہ بھی نبوّت ہی کا ایک تصرف ہے۔

4- سوکھے ہوئے کھجوروں کے جس تنے سے سرکار دو عالم ﷺ ٹیک لگا کر جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے تھے اور اس کا صدمۂ فراق سے پھوٹ پھوٹ کر رونا اور حضور انور کا اَپنے سینے سے لگا کر اسے تسکین دینا نباتات کے قالب میں ایک عاشق پرسوز کا دل منتقل کر دینا بھی نبوّت کا ہی منصب ہے۔

5- غیب کی وہ خبریں دینا جن کی دریافت سے عقلِ انسانی عاجز ہے، یہ بھی منصب نبوت ہی کا ایک خاصہ ہے۔

چنانچہ ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:——

(i) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ باغیوں کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کریں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا۔

(ii) جنگ بدر کے دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے سرداران قریش کے متعلق نام لے لے کر بتایا کہ فلاں یہاں قتل کیا جائے گا۔ فلاں کی لاش یہاں گرے گی، فلاں کا مقتل یہ ہے۔ حضور نے الگ الگ زمین پر خط بھی کھینچ دیا، چنانچہ جب جنگ ختم ہوئی تو لوگوں نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ جس کے متعلق جہاں قتل ہونے کی نشاندہی سرکار نے کی تھی وہ وہیں پر مقتول حالت میں پڑا ہے۔

(iii) سرکار نے اپنے وصال شریف کے وقت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ خبر دی تھی کہ میرے اہل وعیال میں تم سب سے پہلے میرے پاس آؤ گی۔ چنانچہ حضور کے وصال کے بعد سب سے پہلے حضرت سیّدہ کا وصال ہوا۔

(iv) ایک دن حضور کی ازواج طیبات نے حضور سے دریافت کیا کہ آپ کے وصال شریف کے بعد ہم میں سے کون سب سے پہلے آپ سے ملے گا۔ حضور نے جواب مرحمت فرمایا کہ تم میں سے جس کا ہاتھ سب سے زیادہ لمبا ہے وہی میرے پاس آنے والوں میں سبقت کرے گی —— ہاتھ کی لمبائی سے سرکار کی مراد سخاوت و فیاضی تھی۔ چنانچہ حضرت زینب بنت جحش جو ساری ازواج طیبات میں سب سے زیادہ سخی اور فیاض تھیں۔ حضور کے وصال شریف کے بعد ازواج میں سب سے پہلے اُن ہی کا وصال ہوا۔

نوٹ: اس واقعہ میں خاص طور پر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج طیبات کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ حضور کو اس بات کا علم ہے کہ کون کب انتقال کرے گا، اگر اُن کا یہ عقیدہ نہ ہوتا تو وہ ہرگز اپنے متعلق اس طرح کا سوال نہ کرتیں دوسری چیز یہ ہے کہ حضور نے بھی جواب مرحمت فرما کر ان کے اس عقیدے کی توثیق فرمادی، ورنہ اس طرح کا عقیدہ اگر خلاف

حق اور شرکت ہوتا تو حضور اپنی ازواج طاہرات کو ضرور متنبہ فرماتے کہ کب کن کی وفات ہو گی اس کا علم مجھے نہیں دیا گیا ہے۔ میرے متعلق اس طرح کا عقیدہ نہ رکھو۔

(v) ہجرت کے موقع پر حضرت سراقہ کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ وہ سرخ اونٹ کے لالچ میں حضور کو گرفتار کرنے کیلئے ان کے تعاقب میں نکلے کئی بار ایسا موقعہ آیا کہ وہ حضور کے قریب پہنچ گئے اور کمند ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ حضور نے اشارہ کیا اور وہ زمین میں دھنس گئے۔ حضور نے فرمایا کہ سراقہ! میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کا کنگن دیکھ رہا ہوں۔ یعنی تمہارے حق میں اسلام وایمان کی دولت مقدر ہو چکی ہے تم تقدیر الٰہی سے جنگ نہ کرو —— چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ خلافت فاروقی میں جب ایران فتح ہوا تو مال غنیمت میں کسریٰ کے کنگن بھی آئے تھے۔ اور وہ حضرت سراقہ کو پہنائے گئے —— حضرت سراقہ کو حضور کے اس فرمان کا اتنا یقین تھا کہ ایک بار وہ سخت بیمار ہو گئے۔ حالت نہایت سنگین ہو گئی لیکن لوگوں سے وہ کہتے تھے کہ مجھے اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک کسریٰ کا کنگن میری کلائی میں نہ پڑ جائے۔

(vi) جنگ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام نے حضور کے سامنے ایک سپاہی کا تذکرہ کیا جس نے اس دن نہایت بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ حضور نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ جہنمی ہے۔ صحابہ کرام کو سخت حیرت ہوئی۔ لیکن چونکہ حضور کا یہ فرمان تھا اس لئے انہیں یقین تھا کہ سرکار نے سچ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ اس سپاہی کے پیچھے لگ گئے۔ اسے میدان جنگ میں کئی جگہ نہایت کاری زخم آئے تھے جس کی ٹیس سے وہ بے چین تھا۔ جب اس سے نہیں رہا گیا تو شدت کرب میں جنگل کی طرف بھاگا اور وہاں پہنچ کر خودکشی کر لی —— یہ منظر دیکھ کر صحابہ کرام نے حضور کی صداقت کا نعرہ بلند کیا۔

نوٹ: یہاں تک سرکار کی غیب دانی سے متعلق چند واقعات کی طرف اشارہ تھا اب حضور کے عام معجزات کے بیان کی طرف پھر پلٹتا ہوں ——

6- ہجرت کی شب میں قبائل کفر کے سارے نمائندے حضور کے کاشانۂ اقدس کا محاصرہ

کیے کھڑے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں زہر کی بجھی ہوئی ننگی تلواریں تھیں، لیکن پچھلے پہر سرکار ان کی پلکوں کے نیچے سے نکل گئے اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ آنکھوں کی بصارت پر اس طرح پردہ ڈال دینا کہ سینکڑوں آدمی کھلی آنکھوں سے دیکھیں اور کوئی نہ دیکھ سکے، یہ عالم محسوسات کا نہایت حیرت انگیز تصرف ہے۔

7- متعدد روایتوں سے اس طرح کے واقعات منقول ہیں کہ میدان جنگ میں بعض بعض صحابہ کو ایسا زخم پہنچا کہ آنکھیں باہر نکل آئیں۔ وہ اپنی آنکھ کا ڈھیلا ہاتھ میں لئے ہوئے سرکار کے پاس فوراً دوڑتے ہوئے آئے۔ حضور نے وہ ڈھیلا اٹھا کر پھر آنکھ کے حلقے میں اپنی جگہ پر رکھا اور اپنا ہاتھ اس پر پھیر دیا۔ دست انور کے مس ہوتے ہی آنکھ اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

آنکھ سے باہر آ جانے والے ڈھیلے کو آن واحد میں پھر آنکھ کے اندر واپس کر دینا اور اسے پہلی طرح صحیح و سالم بنا دینا یہ عالم محسوسات کا کھلا ہوا تصرف ہے۔

8- عرب میں حکم ابن عاص نامی ایک نہایت گستاخ شخص تھا۔ ایک دن وہ حضور کے خرام ناز کا مذاق اڑانے کیلئے عجیب طرح سے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگا، وہ اپنی چال بگاڑ کر اپنے تئیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل اتار رہا ہے۔ اسی جگہ فوراً قہر الٰہی کی بجلی گی۔ چنانچہ جس انداز میں وہ ٹیڑھے ہو کر چل رہا تھا اس حالت سے وہ باہر نہیں نکل سکا۔ عمر بھر اسی طرح ٹیڑھے ہو کر چلتا رہا —— لوگ اسے دیکھتے تھے تو خدا کی پناہ مانگتے تھے۔

روئے زمین پر قہر خداوندی کے عتاب کا ایک چلتا پھرتا نشان تھا۔

9- مدینے میں ابن البرصا نامی ایک شاعر تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جس کا نام اُم شبیب تھا۔ سرکار نے اس کیلئے اس کے باپ کے پاس نکاح کا ایک پیغام بھیجا۔ پیغام سن کر اس کا باپ سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بہانہ کرتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی برص کی بیماری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس لئے جب تک وہ اچھی نہ ہو جائے ہم اس کے لئے کوئی پیغام قبول کرنے کے قابل نہیں ہیں ——

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں اس غلط بیانی پر ذرا قہر الٰہی کی مار دیکھئے کہ جونہی وہ پلٹ کر

اپنے گھر واپس لوٹا بیٹی سامنے آکر کھڑی ہوگئی، اَب جو نظر اٹھا کر دیکھتا ہے تو سر سے لے کر پاؤں تک سارا بدن برص کے داغ سے سفید ہوگیا ہے —— ساری زندگی وہ اسی حالت میں سڑتی رہی مارے بدبو کے اس کے قریب کوئی بھی نہیں جاتا تھا ——

ذراسی بے ادبی پر عبرتناک سزائیں کیا اس یقین کیلئے کافی نہیں ہیں کہ نبی کی شخصیّت کا اعزاز عام انسانوں کی سطح سے بہت اونچا ہے اور اس طرح کی برتری منصب نبوّت ہی کو زیب دیتی ہے ——

10- احادیث میں اس طرح کے واقعات کی متعدد روائتیں ہیں کہ حضور نے کھانا ہاتھ میں لیا اور تسبیح کی آواز کان میں آنے لگی۔ پھر برتن میں رکھ دیا آواز بند ہوگئی۔

راستوں سے گذرتے ہوئے یمین و یسار سے صلوٰۃ وسلام کی آواز آرہی ہے پلٹ کر دیکھا تو سنگریزے سلام عرض کررہے ہیں۔

ایک یہودیہ عورت کے متعلق یہ روایت عام ہے کہ اس نے ازراہ عداوت بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا تھا تا کہ حضور کو گزند پہنچے لیکن کف دست کی ہڈی نے حضور کو یہ خبر دی کہ اس گوشت میں زہر ملا ہوا ہے۔

حضور نے ایک دن حضرت مولا علی، سیّدہ فاطمہ اور حضرات حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اَپنی کملی میں چھپا کر دعا فرمائی۔ دعا کے اختتام پر دروازوں کے پٹ اور دیواروں نے بآواز بلند آمین کہا۔

11- عالم محسوسات کے یہ کھلے ہوئے تصرفات منصب نبوّت کی بہترین نشانیاں ہیں لیکن حضور کی پیغمبرانہ عظمت کی سب سے عظیم و جلیل نشانی ''کتابِ الٰہی'' ہے۔ سرکار کا یہی وہ تنہا معجزہ ہے جو آج تک اَپنی اصل حالت میں انسانوں کے درمیان موجود ہے۔

قرآن کا سب سے روشن کمال یہ ہے کہ ہر دور میں ہر جگہ اسے دانشوروں نے اَپنی زندگی کا دستور العمل بنایا اور ظروف و احوال اور مزاج و طبائع کے گونا گوں اختلافات کے باوجود قرآن نے یکساں طور پر سب کو زندگی کی مسرّتوں سے ہمکنار کیا ——

12- قرآن کی سچائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ سارے فصحائے عرب کو اس

نے چیلنج کیا کہ قرآن اگر خدا کی کتاب نہیں ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی کتاب ہے تو تم بھی انسان ہو۔ اور یہ فطرت انسانی ہے کہ انسان انسانی بناوٹوں کی نقل اتار سکتا ہے۔ لٰہذا تم بھی اس کے مثل ایک مختصر سے مختصر آیت بنا کر لاؤ ——

آج چودہ سو برس کا عرصہ گذر گیا لیکن دنیائے کفر کے کسی سخنور کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ قرآن کے اس چیلنج کا جواب دینے کیلئے کھڑا ہوتا۔

اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ قرآن کو شکست دینے کیلئے جنگ کرتے ہیں، لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں، خود بھی قتل ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی شہید کرتے ہیں خود قید ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی قید کرتے ہیں —— لیکن اتنا چھوٹا اور آسان کام ان سے نہیں ہو سکتا کہ عرب کے سارے فصحا مل کر قرآن کی طرح ایک آیت بنا لائیں۔

اتنی واضح صداقتوں کے بعد بھی اگر کوئی محمد عربی ﷺ کو خدا کا پیغمبر نہیں مانتا تو وہ کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دوپہر کے سورج کا منکر ہے۔ (احیاء العلوم کتاب العقائد)

تفسیر صاوی

تصنیف: حضرت الشیخ العارف امام احمد صاوی رحمۃ اللہ علیہ

حکمت صلوٰۃ سلام

آیت کریمہ ـــــ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاo کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں ـــــ اس آیت کریمہ میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے بندوں پر یہ بھید ظاہر کر دیا گیا ہے کہ خدائے ذوالجلال اور اس کے تمام فرشتے مدنی محبوب پر دُرود بھیجتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تم بھی مدنی محبوب پر درود و سلام بھیجو۔

حدیث میں ہے کہ یہ آیت کریمہ جب نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ جہاں تک سلام کا تعلق ہے اس کا طریقہ تو ہم جانتے ہیں البتہ دُرود ہمارے لئے نئی چیز ہے اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ دُرود بھیجنے کا طریقہ کیا ہے۔

سرکار نے انہیں درود کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یوں کہو: ـــــ

اللّٰھم صلی علی سیدنا محمد۔

"اے اللہ! ہمارے سردار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نازل فرما"۔

آیت کا ترجمہ اور اس کے ضروری متعلقات کو سمجھ لینے کے بعد اب ذیل کی بحث کو ملاحظہ فرمایئے: ـــــ

پہلی بحث:

خداوند قدوس نے بندوں کو حکم دیا ـــــ نبی پر درود بھیجو ـــــ بندوں نے اس حکم

کی تعمیل یوں کی ـــــ اے خدا! تُو نبی پر درود بھیج۔ اَب سوال یہ ہے کہ یہ تعمیل ہوئی یا بات اُلٹ دی گئی۔

پھر اسی آیت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا اَپنے نبی پر درود بھیجتا ہے ـــــ اَب یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ جب خداوندا اَپنے نبی پر دُرود بھیجتا ہی ہے تو بندہ سے یہ کہلوانا کہ اے خدا! تو اپنے نبی پر درود بھیج۔ کیا دوسرے لفظوں میں تحصیل حاصل نہیں ہے ـــــ؟ کیونکہ بندے نہ بھی درود بھیجنے کی التجا کریں جب بھی وہ درود بھیجتا ہے بھیجتا رہے گا پھر آخر اس کہنے کا مدعا کیا نکلا ـــــ؟

پہلے سوال کا جواب:

یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ لفظ درود کا مفہوم سامنے نہیں ہے۔ ورنہ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا کہ بات اُلٹی نہیں گئی ہے نہایت واضح لفظوں میں اَپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

''درود'' سے یہاں جو معنی مُراد لئے گئے ہیں وہ ہے ''رفعتِ شان کا اہتمام'' دوسرے لفظوں میں اب حکم الٰہی کی تعبیر یہ ہوئی۔

اے میرے بندو! نبی کی رفعتِ شان کا اہتمام کرو!

اب ذرا خالی الذہن ہو کر سوچو کہ خاکدان گیتی کے یہ کثیف و آلودہ انسان اس ظلمت کدۂ خراب کی یہ تیرہ و تاریک مخلوق اور اس عالم زیرین کے یہ حیران و اجنبی مسافر جو خود اَپنے وجود کے عرفان سے آشنا نہیں ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم اس ہستی مقدس کی رفعت شان کا اہتمام کرو جو دونوں جہان کیلئے سرتاسر مشیت الٰہی کا ایک سربستہ راز ہے رفعت شان کا اہتمام تو بڑی بات ہے کہ اصل شان ہی سے کوئی باخبر نہیں ہے۔ عالم تجلیات کے ایک پیکر اسرار سے خاک زادوں کا اَپنے طور پر آخر رشتہ ہی کیا ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی شان سے واقف ہو سکیں گے۔ لہٰذا اب حکم کی تعمیل ہو تو کیونکر ہو۔

اس لئے ناچار پھر اُسی خداوند کے آگے قاصر و مجبور انسانوں کو ملتجی ہونا پڑا کہ خداوندا! تو ہی اَپنے محبوب کی عظمت و شان سے خوب واقف ہے۔ پس تیرے تئیں جیسی رفعتیں ان

کی شایان ہوں ان کا تو ہی اہتمام فرما ——
ہم گنواروں میں کہاں اتنی معرفت کہ تیرے محبوب کی بلندیوں کا اندازہ لگا سکیں۔
ہمیں تو ان کی چوکھٹ پر کھڑے ہونے کا بھی سلیقہ نہیں معلوم! ان کی رفعت شان کا اہتمام ہم سے کیا ہو سکے گا۔

سچ پوچھو تو عجز و درماندگی کے اسی اعتراف نے اب تعمیل حکم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے لئے اب یہی تعمیل حکم ہے کہ بار بار ہم اپنی عجز و درماندگی کا اعتراف کریں کہ وہ اَپنے نبی کی رفعت شان کا اہتمام کرے۔

دوسرے سوال کا جواب:

بندوں کا خدا سے یہ التجا کرنا کہ "تُو نبی پر درُود بھیج" تحصیل حاصل نہیں ہے۔
تم ذرا بھی غور و فکر سے کام لوگے تو تم پر یہ راز کھل جائے گا کہ "اے اللہ تُو نبی پر درُود بھیج" اس ایک فقرے میں عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کی عظیم و جلیل تفصیل چھپی ہوئی ہے۔ یہ مختصر سا فقرہ تنہا نہیں ہے۔ اس کا رشتہ ایمان کے بہت سارے حقائق سے منسلک ہے۔
دراصل اس فقرے کے ذریعہ ایک بندہ اَپنے دل کے اس اعتراف کا اظہار کرتا ہے کہ تیرے محبوب کی عظمتیں اتنی بے پایاں ہیں کہ ہم ان کی سرحدِ ادراک کے قریب پہنچ سکتے ہیں، نہ ان کی تعبیر کیلئے ہمارے پاس الفاظ ہیں۔
عجز درماندگی کے اس اعتراف کے پیچھے رفعت شان مصطفیٰ ﷺ کی لامحدود وسعتوں کا ایک عالم حیرت تصوّر میں ہے اور اسی کی صدائے بازگشت ہے "یا اللہ تو اپنے نبی پر درود بھیج"۔
پھر اس نکتہ لطیف سے صرف نظر بھی کر لیا جائے، جب بھی بندوں کی یہ التجا بیکار نہیں ہے۔ یہ طلب بالکل اسی طرح کی ہے۔ جیسے کوئی خدا سے رزق طلب کرتا ہے حالانکہ اپنے وعدہ کے مطابق وہ بندوں کے رزق کا خود کفیل ہے، نہ بھی کوئی رزق کا طالب ہو جب بھی وہ اسے رزق عطا کرے گا۔ آخر وہ ان ملحدین کو رزق دیتا ہی ہے جو سرے سے رزاق ہی اسے تسلیم نہیں کرتے۔

پس یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس طرح کی التجاؤں میں ضرورت کی نسبت نیاز بندگی کا تقاضہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔

یہ خدا کی اپنی شان کرم گستری ہے کہ وہ اپنے محبوب کی عزت و رفعت کا اہتمام فرماتا ہے اور فرمائے گا لیکن آخر محبوب کے غلاموں کا بھی تو کچھ فریضۂ منصبی ہے انہیں بھی تو اپنے جذبہ وفا کا اظہار کرنا ہے۔ پس اس التجائے شوق کا یہی مفاد کیا کم ہے کہ نیاز مندگان بارگاہ اس کے ذریعہ اپنی عقیدتوں کا خراج پیش کر لیتے ہیں۔

دوسری بحث:

اس آیۂ مبارکہ سے متعلق دوسری بحث یہ ہے کہ خدا اور اس کے فرشتوں کی طرف تو صرف درود کا بھیجنا منسوب ہے لیکن اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ تم درود بھی بھیجو اور سلام بھی ——— آخر اس تفریق و امتیاز میں کون سی حکمت مضمر ہے۔

عرفائے تفسیر فرماتے ہیں کہ لفظ سلام کا مفہوم سلامتی کے ہم معنی ہیں اسی لئے جو شخص کہ سلامتی کا مستحق نہیں ہے اسے سلام کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور جسے سلام کا مستحق سمجھ کر سلام کر لیا جائے تو لازم ہے کہ اسے کسی طرح کی ایذا نہ پہنچائی جائے۔

چونکہ خدائے عز و جل اور فرشتوں کے بارے میں نبی کو ایذا پہنچانے کا امکان ہی معدوم ہے۔ اس لئے درود ہی پر انحصار کیا گیا لیکن چونکہ بندوں سے اس کا امکان تھا اس لئے ان پر لازم کر دیا کہ درود کے ساتھ ساتھ نبی پر سلام بھی بھیجیں ——— یعنی نبی پر سلام بھیج کر دوسرے لفظوں میں اس بات کا اقرار کریں کہ اور اس امر کا اپنے آپ کو پابند بنائیں کہ وہ زبان، قلم، جوارح، ارادۂ قلب، اشارہ، کنایہ، استلزام، کسی طرح بھی کبھی نبی علیہ السلام کو ایذا نہ پہنچائیں گے۔

اَلْمَوَاهِبُ اللَّدُنِّیَّہ

تصنیف: حضرت شیخ الامام احمد قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ

محبّت رسُول

مدارِ ایمان ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ رسول عربی ﷺ سے محبت کرے ــــ اس مقام پر ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ محبت اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ دل کی ایک اضطراری کیفیت کا نام ہے لہٰذا محبت رسول کے وجوب کا حکم قرآن کی اس آیت سے متصادم ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی چیز کا مکلف نہیں کرتا جو اس کے حدود واختیار سے باہر ہو۔

جواب کے سلسلے میں اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ محبت غیر اختیار ہونے کے باوجود بالکل خودرو نہیں ہے بلکہ چند لگے بندھے اسباب ومحرکات کے ساتھ منسلک ہے۔ محبت جب بھی کسی کے ساتھ واقع ہوتی ہے تو محبت کے مقررہ اسباب میں کوئی نہ کوئی سبب ضرور اس کے پیچھے ہوتا ہے۔

فطرت انسانی کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کے مندرجہ ذیل اسباب و محرکات تلاش کیے گئے۔

پہلا سبب ــــ حسن وزیبائی   دوسرا سبب ــــ رشتہ قرابت
تیسرا سبب ــــ سخاوت وفیاضی   چوتھا سبب ــــ مشکل کشائی
پانچواں سبب ــــ فضل وکمال   چھٹا سبب ــــ محبت

فطرت انسانی موجودات میں سے کسی بھی موجود کے ساتھ جن اسباب ومحرکات کے زیر اثر محبت کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ محمد عربی ﷺ کے بارے میں فطرت انسانی کا یہ

تقاضا بدل جائے۔

پس میں تمام اہل نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ پوری دیانتداری کے ساتھ میرے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود میں محبت کے مذکورہ بالا اسباب ومحرکات کا ہجوم ملاحظہ فرمائیں ——— اَب میں الگ الگ سب پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گا۔

حُسن وزیبائی:

اس پیکر جمیل کے حسن وزیبائی کا کیا کہنا! جس نے ایک نظر دیکھ لیا شیفتہ ہوگیا۔ حسن یوسف کی چہار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن وہ خود سرکار کے نمکدان حسن سے ملاحت کی بھیک مانگتا ہے۔ دیکھنے والے گواہ ہیں کہ سرکار سے بڑھ کر نہ کوئی حسین وجمیل اس وقت تھا، نہ پیدا ہوا، نہ پیدا ہوگا۔

چاندنی رات میں سرکار کے چہرہ جمال کا ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے کہ حضور کی طلعت وزیبائی کے آگے چودہویں رات کا چاند بھی ماند تھا۔

رشتۂ قرابت:

خون اور نسب کا رشتہ پھر بھی رگ جاں سے قریب نہیں ہے، لیکن میرے آقا کا قرب رگ جاں سے بھی زیادہ ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں پیرائیہ محسوس میں قرآن نے اَپنے محبوب کے اس رشتہ قرب کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ سرکار کی پاک بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ بلکہ بعض عرفاء نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضور سارے مسلمانوں کے معنوی اور روحانی باپ ہیں۔

جب حضور جان سے بھی زیادہ قریب ٹھہرے تو اَب اس سے زیادہ قریب کون سا رشتہ متصوّر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رشتے کے سامنے سارے رشتے ٹوٹ گئے۔

سخاوت وفیاضی:

یہ وصف جمیل بھی سرکار کے اندر علی وجہ الاتم موجود تھا، بلکہ تھا نہیں آج بھی ہے، سرکار

خود ارشاد فرماتے ہیں کہ ـــــ اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں ـــــ دنیا میں جتنے سخی اور فیاض ہیں انہیں بھی جو کچھ ملا ہے یا ملتا ہے یا ملے گا ذریعہ کے طور پر سرکار صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دست کریم درمیان میں ہے۔

حضور کی سخاوت و فیاضی کے محیر العقول واقعات آج بھی کتابوں میں موجود ہیں، خود فاقے سے رہے لیکن دوسروں کو آسودہ رکھا۔ ان کے دربار میں زبان کھولنے کی بھی ضرورت نہیں بے مانگے ملتا تھا۔ اور بلا شبہ آج بھی سرکار اپنے حریم اقدس سے سارے جہان کو سیراب فرما رہے ہیں۔

مشکل کشائی:

اس وصف میں بھی حضور سارے جہان میں بے مثال و یکتا ہیں۔ دنیا میں آپ کے چشم کرم سے مشکلات کی جو گرہیں کھلتی ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا ہے ہر شخص اپنے معاملات میں اپنے تئیں اُسے جانتا ہے۔ اُس عالم کی بات کر رہا ہوں جہاں سوا میرے سرکار کے اور کسی کا عالم ہی نہیں ہے، وہاں قبر سے لے کر حشر تک حضور کی مشکل کشائی کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں، بات طویل ہو جائے گی ورنہ میں تفصیل سے بتاتا کہ قبر میں کس طرح سرکار اپنے حیران و متوحش غلاموں کی مشکل کشائی اور دستگیری فرماتے ہیں اور کل عرصہ محشر میں جبکہ نسل انسانی مایوسی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو رہی ہو گی اس عالم کرب میں سرکار کس طرح عقدہ کشائی فرمائیں گے۔

فضل و کمال:

انسانوں کا یہ وصف خدا ہی کا عطیہ ہے لیکن میرے سرکار کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا اُن پر فضل عظیم ہے، عام انسانوں کی بات چھوڑیئے کہ خدائے کریم نے انہیں صف انبیاء و مرسلین میں بھی فضل و کمال کی شہنشاہی عطا فرمائی ہے بلکہ جس نے بھی فضل و کمال کی کوئی نعمت پائی ہے اسی سرکار کے دم قدم کی نسبت درمیان میں واسطہ ہے ـــــ پس جس کی غلامی میں فضل و کمال کی بادشاہتیں ملتی ہیں خود اس کے فضل و کمال کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

محبت:

سرکار کو اپنی امت سے کیسی محبت تھی اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے حجرۂ عائشہ سے لے کر صحرائے مدینہ کی تنہائیاں ایک ایک ذرّہ شاہد عدل ہے کہ حضور کے تئیں اپنی امت سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں تھی۔ سفر معراج سے لے کر عالم نزع تک، خوشی اور کرب کے کسی مرحلے میں بھی امت لمحہ کیلئے او جھل نہیں ہوتی۔

یہاں تک کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:ــــــ

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔

''آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے''۔

تو حضور نے فرمایا:ــــــ

اِذَنْ لَا اَرْضٰى وَ واحد مِن امتی فی النار۔

مَیں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک میرا ایک اُمّتی بھی دوزخ میں ہوگا۔ محبوب کے اس ناز کے پیچھے جھانک کر دیکھو تو رحمت و محبت کا ایک دریائے ناپیدا کنار موجزن ہے۔

اَب عقل و نقل اور عادت و فطرت کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھ کر انصاف سے بتاؤ کہ محبت کے سارے اسباب و محرکات ایک ساتھ جس پیکر وجود میں مجتمع ہو گئے ہیں آدمی اس سے محبت نہیں کرے گا تو کس سے کرے گا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اس محبت کرنے کا معاملہ اس معنی کر ضرور بشر کے حدود و اختیار سے باہر ہے کہ ان اسباب و محرکات کی موجودگی میں کوئی قدرت نہیں رکھتا کہ اپنے آپ کو اس پر شیفتہ و شیدا ہونے سے روک سکے ــــــ

فتبارك الله احسن الخالقين۔

اَلْاَمْنُ وَالْعُلٰی

تصنیف: حضرت شیخ الامام احمد رضا البریلوی رحمۃ اللہ علیہ

ایک رقت انگیز حدیث

امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ ایک دن سرکار روالا تبار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ناگہاں ایک اونٹ دوڑتا ہوا آیا اور حضور کے سر مبارک کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ حضور نے فرمایا اے اونٹ ٹھہر! اگر تو سچا ہے تو تیرے سچ کا پھل تیرے لئے ہے اور جھوٹا ہے تو تیرے جھوٹ کا وبال تجھ پر ہے۔

ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو ہماری پناہ میں آئے اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے امان رکھی ہے اور جو ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کرے وہ نامراد نہیں۔

صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ اونٹ کیا کہتا ہے؟ فرمایا اس کے مالکوں نے اسے حلال کر کے کھالینا چاہا تھا یہ اُن کے پاس سے بھاگ کر تمہارے نبی کے حضور فریاد لایا ہے۔

واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ ہم یونہی بیٹھے ہوئے تھے کہ اس کا مالک دوڑا ہوا آیا۔ اونٹ نے جب اَپنے مالک کو دیکھا تو اس طرح حضور کے قریب سمٹ آیا جیسے کوئی کسی کے دامن کی پناہ لیتا ہے۔ اس کے مالک نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ ہمارا اونٹ ہے تین دن سے بھاگا ہوا تھا آج حضور کے پاس یہ ملا ہے ——— سرکار نے فرمایا سنتے ہو! اس نے ہمارے حضور نالش کی ہے اور بہت ہی بُری نالش ہے ——— اس نے پوچھا: یارسول اللہ! یہ کیا کہتا ہے؟ فرمایا: یہ کہتا ہے کہ وہ برسوں تمہاری امان میں پلا۔ موسم گرما میں اس کی پیٹھ پر اسباب لاد کر تم اسے سبزہ زاروں میں لے جاتے اور موسم سرما میں گرم مقامات کی طرف کوچ کرتے۔

جب وہ بڑا ہوا تو تم نے اسے سانڈ بنالیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے نطفے سے تمہارے بہت

سے اونٹ کر دیئے جو چراگاہوں میں چرتے پھرتے ہیں، اَب جو یہ شاداب برس آیا تو تم نے اسے ذبح کر کے کھالینا چاہا ــــــ وہ بولے: یارسول اللہ! یہ ٹھیک ہی کہتا ہے بالکل ایسا ہی واقعہ ہوا۔

پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ نیک مملوک کا بدلہ اس کے مالکوں کی طرف سے یہ نہیں ہے ــــــ وہ بولے! تو، یارسول اللہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ اسے ذبح کریں گے نہ اسے بیچیں گے ــــــ فرمایا: غلط کہتے ہو اس نے تم سے فریاد کی تو تم ان کی فریاد کو نہ پہنچے، اب میرے پاس یہ اپنی فریاد لایا ہے تو میں زیادہ مستحق ہوں کہ اس کی فریاد کو پہنچوں اور اس پر ترس کھاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت تو منافقین کے دل سے نکال لی ہے اور اہل ایمان کے قلوب میں اسے بھر دیا ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے وہ اونٹ سو روپے میں مالک سے خرید لیا اور اس سے ارشاد فرمایا: اے اونٹ! چلا جا تو اللہ عزوجل کیلئے آزاد ہے۔ یہ سن کر وہ خوشی سے جھومنے لگا۔ اور حضور کے گوشِ مبارک کے قریب اپنا منہ لے جا کر تین بار ایک عجیب آواز نکالی۔ ہر بار حضور نے آمین کہی۔ چوتھی بار حضور آبدیدہ ہو گئے۔

صحابہ نے دریافت کیا حضور! اس نے اپنی زبان میں کیا کہا ہے؟ فرمایا پہلی بار اس نے یہ دعا کی کہ

یا نبی اللہ! اسلام وقرآن کی طرف سے خدا آپ کو بہترین جزاء عطا کرے۔ میں نے کہا آمین پھر اس نے کہا اللہ تعالیٰ کل قیامت کے دن آپ کی امت سے بھی اسی طرح خوف دُور کر دے جس طرح آج آپ نے میرا خوف دُور کیا ہے۔ میں نے کہا آمین۔

پھر اس نے کہا اللہ آپ کی امت کا خون اس کے دشمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے (یعنی وہ انہیں دنیا سے فنا نہ کر سکیں) جس طرح آپ نے میرا خون محفوظ فرما دیا۔ میں نے کہا آمین!

پھر اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کی اُمت کو باہمی خونریزی سے بچائے اس پر مجھے رونا آ گیا۔ کیونکہ یہ سب مرادیں میں اَپنے رب سے مانگ چکا ہوں۔ سب مرادیں قبول ہوئیں لیکن پچھلی مراد مانگنے سے مجھے روک دیا گیا اور حضرت جبرئیل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا کا یہ پیغام مجھ تک پہنچایا کہ قلم چل چکا ہے کہ میری امت خود اپنی ہی تلوار سے فنا ہو گی۔

بارشِ نور

آج سرکار کے ایک چہیتے صحابی کا اِنتقال ہو گیا تھا۔ ایک پروانہ انس محفلِ نور سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا تھا۔ جہاں عرش کی قندیل کا چراغ ہر وقت فروزاں رہتا تھا۔ مدینے کے چمنستان کرم میں اَب بھی ہزاروں پھُول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن عندلیبان چمن کے فروغ محبت کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک پھُول مرجھا گیا تھا تو ہر طرف سوگوار اداسیوں کی شام ہو گئی تھی۔

بھیگی بھیگی پلکوں کے سائے میں جنازہ اُٹھا تو غمگساروں کے اژدھام سے گلیوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں تھی۔ خود کائنات ہستی کے سرکار اعظم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھی اپنے ایک شیدائی کی مفارقت سے بہت زیادہ غمگین و آبدیدہ تھے۔

مدینے کے مشہور قبرستان، جنت البقیع میں جب لوگ جنازہ لے کر پہنچے تو لحد تیار ہو چکی تھی۔ جنازہ اتارنے کیلئے سرکار خود بہ نفس نفیس لحد میں تشریف لے گئے اور اپنے نورانی ہاتھوں سے جنازہ کو فرش خاک پر لٹایا ——— سرکار کی اس ادائے رحمت پر ہر شخص مچل کے رہ گیا کہ کاش مرنے والے کی جگہ پر ہم ہوتے اور سرکار کے قدسی ہاتھوں سے ہماری لاش سپرد خاک کی جاتی۔ عالم گیتی کے مسافر کو گلشنِ جنازہ کی سیر کیلئے اپنی خواب گاہ سے دو قدم بھی نہیں چلنا پڑا، جنت کی ساری بہاریں مرقد ہی میں سمٹ آئیں۔ جس کی لحد میں جنازہ سے پہلے رحمت یزدانی اتر آئی ہو۔ آخر اس پر رشک نہ کیا جائے تو اس بھری کائنات میں اس سے زیادہ اور کون قسمت کا دھنی ہو سکتا تھا؟ مراسم تدفین سے فارغ ہو کر سرکار کاشانۂ اقدس کی طرف واپس ہوئے۔ جونہی دولت سرائے اقبال میں قدم رکھا۔ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا حاضر خدمت ہوئیں اور نشاط قلب و روح کے ساتھ سرکار کا خیر مقدم کیا۔

رُخِ زیبا پر نظر پڑتے ہی ارمانوں کا غنچہ کھل اُٹھا اور چشمۂ نور کی سطح خاموش پر

موجوں کی کرن پھیل گئی۔ جس کے گوہر دنداں کی جوت سے حرم سرا کی دیواریں چمک اٹھتی تھیں اس کے جلوؤں کے سویرے میں سیدہ عائشہ پیکر حیرت بنی کھڑی تھیں۔

زباں خاموش تھی لیکن آنکھوں میں کسی مخفی حقیقت کے تجسس کا اضطراب مچل رہا تھا۔ کبھی سرکار کے پیراہن شریف کا جائزہ لیا۔

آج ان پر حیرت کا کچھ ایسا کیف طاری تھا کہ زبان نہیں کھل رہی تھی اندر ہی اندر دل کا عالم زیروزبر ہو رہا تھا۔

تلاش وطلب کی حیرانی کا یہی عالم تھا کہ لب ہائے گہرریز کو جنبش ہوئی اور سرکار نے ارشاد فرمایا:——

''عائشہ! کیا تلاش کر رہی ہو۔ تمہاری جستجو کا یہ اضطراب بتا رہا ہے کہ کوئی حیرت انگیز واقعہ تمہاری نگاہ سے ضرور گذرا ہے ورنہ اس سے پہلے اپنی آمد کے موقعہ پر تمہاری مسرّت کے ساتھی حیرت کا یہ عالم میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے''۔

اس سوال پر ام المؤمنین کی آنکھیں چمک اٹھیں فرط شوق میں عرض کیا:——

''سرکار! آج آپ کے قبرستان تشریف لے جانے کے بعد بڑے زور کی موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔ مدینے کے سارے ندی نالے جل تھل ہو گئے۔ ہر طرف سیلاب امنڈ آیا۔ لیکن حیرت ہے کہ نہ تو قبرستان میں چھپنے کی کوئی جگہ ہے نہ آپ کے ساتھ محفوظ رہنے کا کوئی سامان ہی تھا۔ آخر اتنی موسلا دھار بارش کہاں گئی کہ نہ آپ کے چہرے پر بوند کا کوئی اثر ہے۔ نہ بالوں میں نمی ہے۔ نہ پیراہن ہی تر ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا واقعہ میرے ساتھ پیش آ گیا ہے۔ عالم اسباب کی کڑیاں ملاتی ہوں تو ایک کڑی بھی نہیں مل رہی ہے ——اسی عالم تحیر میں آج مجھ پر بے خودی کا ایک کیف طاری ہے''۔

حضرت ام المؤمنین کا یہ جواب سن کر سرکار نے پھر ارشاد فرمایا:——

''واقعہ غلط نہیں ہے۔ ضرور تمہاری آنکھوں نے برستے ہوئے بادل دیکھے ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاؤں، تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد تم نے میرے استقبال کا کوئی کپڑا تو اپنے سر پر نہیں رکھ لیا تھا——؟''

ام المومنین نے عرض کیا:——

''آپ کی وہ یمنی چادر جس کے جھرمٹ میں رُوح الامین وحی لے کر اُترتے ہیں۔ اُسے دوپٹے کی طرح البتہ میں نے سر پر ڈال لیا تھا''۔

حضورِ انور کے سوال کا جواب دینے کے بعد ام المومنین گوش بر آواز ہوگئیں۔ نہایت بیتابی کے ساتھ وہ حقیقت کی نقاب کشائی کا انتظار فرما رہی تھیں کہ رحمتوں کے پھول برساتے ہوئے سرکار نے ارشاد فرمایا:——

''عائشہ! یہ وہ بارش نہیں تھی جو آسمان کی کالی گھٹاؤں سے برستی ہے جس سے کپڑے بھیگتے ہیں اور زمین نم ہو جاتی ہے—— بلکہ یہ وہ بارشِ نُور تھی جو عالمِ غیب میں ہر آن میرے اُوپر برستی ہے۔ میرے نُورانی جسم سے مس ہونے والے کپڑے کو جُوں ہی تم نے سر پر رکھا۔ عالمِ غیب کے سارے حجابات اٹھ گئے اور تمہاری آنکھوں نے عالمِ قدس سے برسنے والی بارش کا مشاہدہ کیا''۔

اللہ اکبر! سوچنے کا مقام ہے کہ جس رسولِ انور کے جسمِ پاک سے لگی ہوئی چادر کا یہ فیضان ہے کہ اس کے سائے میں غیب کے دروازے کھلتے ہیں، نظر کے حجابات اٹھ جاتے ہیں خود اُس رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدۂ غیب کا کیا عالم ہوگا——؟

علامہ ارشد القادری

بیتاب آرزُو

مدینے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر احد کے میدان میں آج حق و باطل کا زبردست معرکہ تھا —— دنیائے کفر کے سارے سورما آہن و فولاد کے مہیب ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔

اُدھر سارے قبائل میں شور تھا کہ آج مدینے کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور سطحِ ہستی سے اسلام کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔

اِدھر مدینے میں جذبات کے ہیجان کا یہ عالم تھا کہ مجاہدین کو رات کاٹنی مشکل ہو گئی، جونہی سویرا ہوا، چمکتی ہوئی تلواروں کی جھنکار سے کوچہ و بازار گونج اٹھے۔

ہر جوان سر بکف، ہر بچہ کفن بدوش، ہر عورت دست بدعا اور ہر بوڑھا شوقِ شہادت میں سرشار نظر آ رہا تھا۔

رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی حضرت عمرو بن جموع رضی اللہ عنہ جو پاؤں سے لنگڑے تھے، وہ بھی محاذِ جنگ پر جانے کیلئے تیار ہو گئے۔

لوگوں نے ہزار سمجھایا کہ تم معذور ہو، چلنا پھرنا مشکل ہے تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟ تمہارے چار بیٹے تو جا ہی رہے ہیں اَب تمہارے ذمہ اسلام کا کون سا حق باقی رہ جاتا ہے۔

انہوں نے جذبات سے بیخود ہو کر جواب دیا:

''اسلام کا حق صرف اتنا ہی نہیں ہے، اسلام کا حق یہ بھی ہے کہ کلمۂ حق کی سربلندی کیلئے میری رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہو جائے اور میری لاش کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں۔

میرے لئے کتنی بڑی محرومی کی بات ہے کہ میرے بیٹے تو جنت میں جائیں اور میں

حسرت سے مُنہ تکتا رہوں"۔

اسی بیتابیٔ شوق میں گھر پہنچے تو بیوی نے دیکھتے ہی کہا:——

"جان بچا کر چھپنے والوں کیلئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اُحد کی طرف جاؤ، آج وہی تمہاری منزل عیش ہے"۔

یہ طعنہ ایک تیر نشتر کی طرح جگر میں پیوست ہو گیا زخم کی چوٹ سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تلوار اٹھائی، نیزہ سنبھالا اور قبلے کی طرف رُخ کر کے یہ رقت انگیز دعا مانگی:

اللھم لا تعدنی الی اھلی۔

"اے اللہ! اَب مجھے اپنے اہل وعیال میں واپس نہ لائیو!"

اور شوق شہادت کے سرور میں گھر سے باہر نکلے۔ سیدھے بارگاہ رسالت میں حاضری دی۔ صلوٰۃ وسلام پیش کیا، بیٹھ گئے، چند لمحہ انتظار کے بعد جب سرکار متوجہ ہوئے تو عرض کیا:

"یارسول اللہ! سرفروش مجاہدین کا لشکر جنت کی طرف بڑھ رہا ہے مجھے بھی اجازت مرحمت فرمایئے، مَیں بھی شامل ہو جاؤں"۔

سرکار نے ارشاد فرمایا:——

"تم پر جہاد فرض نہیں ہے۔ تم معذور ہو۔ میدان کارزار میں جا کر کیا کرو گے"۔

ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ عرض کیا:——

"حضور! بہت دنوں سے آرزو ہے کہ اَپنے لنگڑے پاؤں سے جنت کی سرزمین پر چہل قدمی کروں۔ سُنا ہے کہ میدان جنگ سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم کا ہے اس سے زیادہ قریب مسافت کی کوئی راہ مجھے نہیں مل سکتی۔

پاؤں تو ٹوٹ ہی چکا ہے، اجازت نہ ملی تو دل بھی ٹوٹ جائے گا حضور! مانتا ہوں کہ میدان کارزار میں جا کر کچھ نہیں کر سکوں گا لیکن اپنے مولیٰ کی خوشنودی کیلئے شہید تو ہو سکتا ہوں؟ ویسے میں معذور ضرور ہوں، لیکن گھائل ہو کر آپ کے قدموں میں تڑپنے کیلئے معذور نہیں ہوں آقا!

عالم قدس کا جمال اَب ایک لمحہ کیلئے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ سر وبال دوش بن گیا

ہے سرکار! میری درخواست قبول کر لی جائے لشکر آگے بڑھ رہا ہے۔ اَب اجازت عطا فرما دیں"۔

بالآخر ان کے پُرشوق اصرار پر حضور ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرما دی۔

اجازت ملتے ہی وہ جھومتے ہوئے اٹھے اور مستانہ وار اداؤں کے ساتھ جست لگاتے، تڑپتے، اُچھلتے لشکر سے جا ملے۔ اب ان کی آنکھوں میں یقین کی شمع جل رہی تھی۔ اور نہایت بیتابی کے ساتھ اُس ساعت ارجمند کا انتظار کر رہے تھے جب ابدی نیند کیلئے پلک جھپکے اور دوسرے ہی لمحہ آنکھ کھلے تو فردوس کا دلکش نظارہ سامنے ہو۔

اُحد کا میدان عاشقانِ اسلام کے قدموں کے نیچے بچھا جا رہا تھا اور کہسار کی چوٹیاں جُھک جُھک کر بلند نیزوں کو سلام کر رہی تھیں۔ کوثر کی شراب وادی کے قریب ہی سے بہہ رہی تھی، جنت کا نگارخانہ پہاڑ کے دامن میں نصب کر دیا گیا تھا۔ محرم آنکھوں پر غیب کے چہرے آج بے نقاب ہو گئے تھے۔ مخفی حقیقتیں اَب حجابات کے پیچھے نہیں تھیں، برملا نگاہوں کی زد پر تھیں۔ اسی عالم رنگ و نور میں مجاہدین کی صفیں آراستہ ہوئیں۔ ہیبت جلال سے دھرتی کا سینہ دہل گیا۔

وہ تماشا بھی قابل دیدنی تھا، جب لشکر کا والی، قطار کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر اَپنے جانثاروں کی فلک پیما ہمتوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نقارۂ جنگ بجا، مجاہدین آگے بڑھے۔ تلواریں چمکیں، بجلی گری، نیزے اٹھے، کمانیں جھکیں اور دونوں طرف سے گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

اسی عالم قیامت خیز میں حضرت عمرو بن جموع کو دیکھا گیا کہ وہ بھی اَپنے جذبہ ایمانی سے میدان میں بڑھے جا رہے ہیں اور آواز لگاتے جاتے ہیں کہ قسم خدا کی میں جنت کا مشتاق ہوں، صرف ایک ساغر کی آرزو کھینچ کر یہاں تک لائی ہے۔ یہ سینہ ہے، یہ سر ہے، یہ گردن ہے، آؤ مجھے گھائل کرو، میں زخمی ہو کر تڑپنا چاہتا ہوں، دشمنانِ حق کے لہو سے میں اَپنی تلوار کی پیاس بُجھا چکا ہوں۔ اَب میں خود سیراب ہونا چاہتا ہوں۔ بس ایک جام کوثر کا انتظار ہے۔

اسی عالم شوق میں مچلتے، اکڑتے، سینہ تانے، رجز پڑھتے، آواز لگاتے، چلے جارہے تھے کہ ایک زہر میں بجھا ہوا تیر آیا ان کے جگر میں پیوست ہوگیا۔
گھائل ہوکر گر پڑے، رگوں کا سارا خون مقتل کی خاک میں جذب ہوگیا۔ ایک لمحہ کیلئے تڑپے اور خاموش ہوگئے۔
قریب جاکر دیکھا تو رُوح اس دُنیا میں نہیں تھی فردوس کی سرزمین پر چہل قدمی کررہی تھی۔ شہادت کا مشتاق کوثر کا جام خالی کر چکا تھا اور جنّت کا شیدائی ''دختران قدس'' کے جھرمٹ میں مسکرا رہا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت عمرو بن جموع کی اہلیہ شہادت کی خبر پاکر میدان احد میں آئیں۔
چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:——
''عمرو! تمہیں سرمدی نعمتوں کی یہ سرخروئی مبارک ہو۔ حسینان فردوس کی انجمن میں مجھے بھول نہ جانا پیارے اسی کیلئے دروازے تک میں نے تمہیں رخصت کیا تھا۔
مجھے اپنی بیوگی کا غم نہیں، تمہاری شہادت کی خوشی ہے۔ خدا اسی خوشی کو سلامت رکھے''۔
یہ کہہ کر بھیگی پلکوں کے سائے میں انہوں نے اپنے اونٹ کو بٹھایا۔ اور جنت البقیع میں دفنانے کی غرض سے شوہر کی لاش کو اس پر بار کیا۔ جونہی اونٹ کی مہار پکڑ کر مدینے کی طرف بڑھیں کہ اچانک اونٹ بیٹھ گیا۔ ہزار کوشش کی لیکن اونٹ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔
دوڑی ہوئی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا ماجرا بیان کیا۔
حضور نے ارشاد فرمایا:——
''اونٹ کو یہی حکم ہے وہ تقدیر الٰہی سے سرتابی نہیں کرے گا —— اچھا بتاؤ! کیا دم رخصت عمرو بن جموع گھر سے کچھ کہہ کر چلے گئے تھے؟''
عرض کیا:——
''ہاں! قبلہ رو ہوکر یہ دعا مانگی تھی:——

اَللّٰهُمَّ لَا تُعِدْنِیْ اِلٰی اَهْلِیْ۔

"یا اللہ مجھے اپنے اہل وعیال میں واپس نہ لائیو"۔

ارشاد فرمایا:——

"ان کی دعا قبول ہوگئی۔ اب ان کی لاش مدینے واپس نہیں جاسکتی۔ انہیں یہیں دفن کردو——میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جنت میں لنگڑاتے ہوئے چل رہے ہیں"۔

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گذرے تو یہاں تک پہنچے

آج بھی اُحد کی وادی میں یہ آواز کبھی کبھی سنائی دیتی ہے——میدان جنگ سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم ہے۔ آخرت کے مسافروں پر اس سے زیادہ قریبی مسافت کی کوئی راہ آج تک نہیں کھلی۔

چندروزہ زندگی کے معاوضہ میں دائمی زندگی کا کاروبار یہیں سے ہوتا ہے۔

علامہ ارشد القادری

شادی کی پہلی رات

حنظلہ ایک شکیل وخوبرونوجوان، حسن وزیبائی کا ایک گل رعنا، اور عشق وایمان کا ایک دھکتا ہوالالہ، اَپنے قبیلہ میں ہر شخص کا محبوب نظر تھا۔

بار حیا سے پلکیں جھکی رہتیں، شوق شہادت میں آنکھوں سے کوثر شراب ٹپکتی۔ عالم تنہائی میں بھی بے داغ جوانی کے انگ انگ سے کردار کا تقدس جھلکتا۔ عفیف و پاکباز حسن کی دلکشی بھی کتنی سحر انگیز ہوتی ہے؟ ایک حنظلہ اپنے قبیلے کے جمالستان میں ہزاروں آرزوؤں کی امید گاہ بن گئے تھے۔ انہیں خود خبر نہیں تھی کہ تصوّرات کی کتنی انجمنوں میں ان کی یادوں کے چراغ جل رہے ہیں۔ اس عالم فانی کی زندگی میں اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ ایک بندۂ مومن کے تمام ارمانوں کا مرکز صرف رسول کونین ﷺ کی ہستی ہے۔ شمعِ رسالت کے پروانوں کیلئے اس گیتی پر ایمان سے زیادہ کوئی لذیذ چیز نہیں ہے۔ میکدۂ عرفان کا یہ بادہ نوش حسن وشراب کی سرمستیوں پر تھوکنا بھی اپنی بے نیازیوں کی توہین سمجھتا ہے۔

یہی وہ لافانی تصوّرات تھے جن کی لہروں میں حضرت حنظلہ کی زندگی شرابور رہا کرتی تھی صحبت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیضان سے ان کے روحانی تقدس کا فروغ اب اس نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا، جہاں دامنِ تر کے ٹپکتے ہوئے قطروں سے گلہائے قدس کے لئے شبنم مہیا کی جاتی ہے۔

اسی رنگ ونور کے پاکیزہ ماحول میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے دن گذرتے گئے، عمر کا کارواں آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ جب ان کے حسن وشباب کا سورج خط نصف النہار پر پہنچ گیا تو ماں نے ایک دن بیٹے کے سامنے اس آرزوئے شوق کا اظہار کیا:

”میرے ارمانوں کے شگفتہ پھول! تمہاری شادی کیلئے قبیلے کے ممتاز گھرانوں سے

بہت سے پیغامات آرہے ہیں اجازت دو تو کوئی مناسب پیغام منظور کرلوں"۔

بیٹے نے ماں کے قدموں کا بوسہ لیتے ہوئے جواب دیا:——

"میری زندگی کو اسیر شوق بنانے کیلئے وہی زنجیر بہت کافی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اَب دل کا کوئی گوشہ التفات غیر کیلئے خالی نہیں ہے۔ چراغ قدس کے پروانے کو اسی شبستان میں رہنے دو ماں! جہاں دونوں جہاں کی فراغت نصیب ہے۔ بے نیام تلواروں اور لالہ کی طرح سُرخ میدانوں سے زندگی کی رفاقت کا عہد کرنے والوں کو اَب اور کسی عہد و پیمان وفا کی طرف مت لے جاؤ۔

شہنشاہ کونین کا منادی کب آواز دے دے، کسی کو کیا معلوم؟ ایک کفن بر دوش مجاہد کو ہر وقت گوش بر آواز رہنا چاہیئے"۔

"لیکن بیٹا! رشتہ ازدواج بھی تو اسی شہنشاہ کونین کی سنت ہے جس کے حکم پر گوش بر آواز رہنے کیلئے تم زندگی کی فراغت چاہتے ہو۔ شائد تمہیں اس کی خبر نہ ہو کہ تمہارے اسی موسم حیات کی بہار دیکھنے کیلئے میں نے کتنی صعوبتوں کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا ہے۔ اور کتنے ہی آلام کی بھٹی میں سلگ سلگ کر میں نے اپنی محبوب امیدوں کو مرنے سے بچایا ہے۔ اپنی زندگی کی فصل بہار پر میرے مقدس ارمانوں کا کچھ بھی حق تسلیم ہو تو اجازت دو کہ میں تمہاری پیشانی پر مسرّت و شادمانی کا ایک مہکتا ہوا چمن آباد کروں——"

فیروز مند بیٹے نے سپردگی کے انداز میں سر جھکاتے ہوئے جواب دیا:——

"اَب میرے اندر مزید انکار کی جرأت نہیں ہے۔ مادر مشفقہ کی خواہش کے احترام میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ آپ کی آنکھیں جس طرح بھی ٹھنڈی ہو سکیں میری طرف سے اجازت ہے——"

چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد قبیلے کے ایک معزز گھرانے کا رشتہ منظور کرلیا گیا۔ حنظلہ جیسے شکیل و خوبرو نوجوان کو پالینے کیلئے جہاں بہت سے ارمانوں کا خون ہوا۔ وہاں ایک آرزو پروان چڑھی اور قبیلے کی سب سے حسین و جمیل دوشیزہ حضرت حنظلہ کیلئے منتخب کرلی گئی۔ بالآخر ایک خوشگوار شام کو نشاط و سرور کی پُر نور فضا میں حضرت حنظلہ دولہا بنائے گئے اور نہایت

سادگی کے ساتھ عقد نکاح کی رسم ادا کی گئی۔

آج شادی کی پہلی رات تھی۔ دو دھڑکتے ہوئے دل ہنگامہ شوق کے ایک نئے عالم میں داخل ہو رہے تھے۔ پہلی بار ایک پارسا نوجوان کی نگاہ، حُسنِ زیبائی کی نکھری ہوئی چاندنی میں خیرہ ہو کے رہ گئی تھی۔ ہر طرف ارمانوں کے ہجوم کا پہرہ لگا ہوا تھا، وہ عفت مآب روحوں کی ملاقات کا عالم کیا تھا۔ کون بتائے؟

البتہ تاریخ کے حوالے سے اتنا سراغ ضرور مل سکا کہ رات بھیگ جانے کے بعد پس دیوار اچانک کسی منادی کی آواز فضا میں گونجی اور حضرت حنظلہ چونک اُٹھے۔ نشاط و طرب کے شوق انگیز لمحوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ چہرے پر ایک گہرے تجسّس کا نشان اُبھرا اور شدّتِ اضطراب کے عالم میں کھڑے ہو گئے، دیوار سے کان لگا کر اعلان کے الفاظ کو دوبارہ غور سے سُنا۔

دربارِ رسالت کا منادی آواز دے رہا تھا:——

"کفر کی یلغار اسلام کی فصیل کی طرف بڑھتی آرہی ہے۔ ناموس حق کے پروانے بغیر کسی لمحۂ انتظار کے رسالت کی سرکار میں حاضر ہو جائیں۔ مجاہدین اسلام کا صف شکن قافلہ تیار کھڑا ہے۔ سپیدۂ سحر کی نمود سے پہلے پہلے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو جائے گا"۔

اعلان کے الفاظ سینے میں ترانہ ہو گئے۔ اَب حضرت حنظلہ اپنے آپ میں تھے، جذبات کے تلاطم کا عالم قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ فرض نے انہیں مشکلات کے گھنے اندھیرے سے پکارا تھا۔ بے خودی کی حالت میں ایک بار نظر اُٹھا کر اَپنی نئی نویلی دولہن کو دیکھا حسرت ناک کرب کے ساتھ بڑی مشکل سے یہ الفاظ اَپنے منہ سے ادا کر سکے:

"جانِ آرزو! میدان جنگ سے اسلام نے آواز دی ہے۔ اب ہنگامۂ شوق کے یہ خود فراموش لمحے ختم ہوئے۔ اجازت دو، کہ مجاہدین کی اس قطار میں بڑھ کر شامل ہو جاؤں جو رسالت کی سرکار میں کھڑی ہے۔ زندگی نے وفا کی اور معرکہ کارزار سے بخیر و سلامت واپس سلوٹ آیا تو پھر تمہاری زلفوں کی مہکتی ہوئی رات کا خیر مقدم کروں گا، اور اگر خوش بختی سے میری زندگی کام آگئی اور میرے جگر کا خون اسلام کی بنیاد میں جذب ہو گیا تو پھر قیامت کے

دن شہیدانِ وفا کی صفوں میں تمہیں کہیں نہ کہیں ضرور ملوں گا۔ اچھا اَب اجازت دو وقت بہت نازک ہے"۔

یہ کہتے ہوئے جیسے ہی قدم باہر نکالنا چاہتے تھے کہ بیوی نے دامن تھام لیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بمشکل تمام یہ چند جملے ادا کر سکی ——

"میخانۂ کوثر کی طرف بڑھنے والے کو کون روک سکتا ہے۔ زحمت نہ ہو تو رسولِ کونین ﷺ کے قدمِ ناز کی اَمان میں مجھے بھی لیتے چلو۔ کنیزانِ بارگاہ کی آخری صف میں بھی جگہ مل گئی تو میں اپنی خوش نصیبی پر تا ابد نازاں رہوں گی"۔

حضرت حنظلہ نے دو لفظوں میں جواب دیا: ——

"سرمدی اعزاز کے استحقاق کیلئے تمہاری یہی قربانی کیا کم ہے کہ تم نے بھرپور بشاشت کے ساتھ عیش و نشاط کے اُن دلفریب لمحوں کو اسلام کی ضرورت پر نثار کر دیا۔

یقین رکھو! گلشنِ جاوید کی طرف میں تنہا نہیں جا رہا ہوں تمہارے ارمانوں کا کارواں بھی میرے ہمراہ ہے —— اچھا اب اجازت دو خدا تمہارے صبر و شکیب کی عمر دراز کرے"۔

یہ کہتے ہوئے حضرت حنظلہ گھر سے باہر نکل پڑے۔ جب تک نظر آتے رہے عقیدت بھری نگاہ اُٹھتے ہوئے قدموں کا بوسہ لیتی رہی۔

رات کے پچھلے پہر جاں نثاروں کا لشکر دُعاؤں کے ہجوم میں معرکۂ کارزار کی طرف روانہ ہو گیا۔ جانِ رحمت سرورِ کونین ﷺ ناقۂ مبارک پر سوار تھے۔ پیچھے پیچھے پروانوں کی قطار چل رہی تھی۔ سرکار کے رُخِ زیبا کی تنویر سے مجاہدین کے سینوں میں فاتحانہ شوکتوں کا چراغ جل اُٹھا تھا۔

میدانِ جنگ میں پہنچ کر سرفروشانِ اسلام کی صفیں آراستہ ہو گئیں۔ کفار کے لشکر نے بھی اپنا مورچہ سنبھال لیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت طبلِ جنگ بجتے ہی گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی تلوار بجلی کا شرارہ معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے بے دریغ

حملوں سے لشکر باطل میں ہر طرف ایک شورِ قیامت برپا تھا۔

حضرت حنظلہ کی پیاسی رُوح چشمۂ کوثر کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ عالم جاوید سے اَب چند ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ زہر میں بجھا ہوا ایک تیر ان کے جگر میں آ کر پیوست ہو گیا۔ لہو کے اڑتے ہوئے فوارے سے سارا پیرہن رنگین ہو کے رہ گیا۔ جب تک رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی تھا کلمۃ الحق کی سربلندی کیلئے فولاد کی دیوار بن کر کھڑے رہے۔ جب رگوں کی آگ بجھ گئی تو گھائل ہو کر زمین پر گر پڑے اور چند ہی لمحوں میں روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

دو پہر ڈھلتے ڈھلتے کفار میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو کھلی ہوئی فتح نصیب ہوئی —— جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب زخمیوں کو اکٹھا کیا گیا اور شہیدوں کی لاشیں جمع کی گئیں تو حضرت حنظلہ کی تلاش شروع ہوئی۔ ان کی گمشدگی پر سارے لشکر کو حیرت تھی جب وہ کہیں نہ ملے تو سرکار کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی گئی —— حضور نے چند لمحے توقف فرمانے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: ——

"حنظلہ کی لاش کو عالم بالا میں فرشتے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہاں انہیں غسل دیا جا رہا ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی لاش سامنے موجود تھی۔ بال بھیگے ہوئے تھے۔ خون آلود پیراہن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے —— مدینہ پہنچ کر جب گھر والوں سے ان کے حالات دریافت کیے گئے تو معلوم ہوا کہ رات کو گھر سے چلتے وقت ان پر غسل جنابت فرض ہو چکا تھا۔ اضطراب شوق سے فرض اتارنے کی بھی انہیں مہلت نہیں دی۔ غسل جنابت کا فریضہ عالم بالا میں فرشتوں کے ذریعہ اتارا گیا۔ اسی دن سے حضرت حنظلہ کا لقب بارگاہِ رسالت سے "غسیل ملائکہ" قرار پایا ——

زندہ باد! اسلام کے قابل رشک فرزند زندہ باد!

علامہ ارشد القادری

شوکتِ اقتدار

(1)

آج ہجرت کی رات تھی۔ سارے قبیلے کے نمائندۂ کفر تیغ بے نیام لئے انتظار میں کھڑے تھے اس رسولِ رحمت کے اِنتظار میں جو انہیں ہلاکت وتباہی کے دہانے سے آسائش دوام کی ٹھنڈی چھاؤں میں واپس لانا چاہتا تھا۔ اچانک پچھلے پہر کا شانۂ نبوت کا دروازہ کھلا ایک کرن چمکی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ خدا کا حبیب مسکراتا ہوا باہر نکلا اور تلواروں کے سائے سے گزر گیا۔ سحر کے اُجالے میں صحرائے کفر کے خونخوار درندے جب دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے تو یہ معلوم کر کے حیرت سے وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے کہ پیغمبر ﷺ ان کی پلکوں کے نیچے سے گزر گیا اور انہیں خبر تک نہیں ہوئی۔ ہزار تیاریوں کے باوجود زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کا مصرف حاصل نہیں ہو سکا۔ قبائل عرب کے مشترک محاذ پر آج کی شکستِ فاش سے رہبرانِ کفر تلملا کے رہ گئے۔ فوراً ہی دارالندوہ میں مشاورت کی مجلس منعقد ہوئی اور طے پایا کہ ابھی محمد زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ اگر تعاقب کیا جائے تو آسانی سے انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ہی لمحے کے بعد مکّے کی گلیوں میں اعلان ہو رہا تھا کہ محمد کو جو بھی گرفتار کر کے لائے گا۔ اُسے انعام میں سُرخ اُونٹ دیئے جائیں گے۔

(2)

عرب کے مانے ہوئے شہسوار سراقہ کے کان میں جونہی اس اعلان کی خبر پہنچی وہ انعام کے لالچ میں اس مہم کو سر کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ فوراً ہی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہوئے۔ باگ سنبھالی اور دم کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

کچھ دور چلنے کے بعد انہیں مدینے کے راستے پر دو جھلملاتے ہوئے سائے نظر آئے۔

خوشی سے چہرہ دمک اُٹھا۔ سرخ اونٹوں کی قطار تصور میں رینگنے لگی۔ فرطِ مسرّت میں گھوڑے کو مہمیز لگائی اور ہوا سے باتیں کرتے ہوئے آن کی آن میں قریب پہنچ گئے۔

خدا کا آخری پیغمبر ﷺ اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ناقہ پر سوار مدینے کی طرف تیز تیز بڑھتا جا رہا تھا۔

سراقہ نے کمند ڈالنے کیلئے جونہی قدم آگے بڑھایا۔ ایک پر جلال آواز فضا میں گونجی:

یَا اَرْضُ خُذِیْہِ ——— اے زمین اسے پکڑ لے۔

فرماں روائے کونین کا حکم تھا۔ گیتی کا کلیجہ ہل گیا۔ فوراً زمین شق ہوگئی اور سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں گھٹنے تک دھنس گیا۔ سراقہ نے ہزار کوشش کی۔ لیکن زمین کی گرفت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ جب عاجز و مجبور ہو گئے تو دو عالم کے تاجدار سے رحم کی درخواست کی۔ سرکار نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور زمین سے خطاب فرمایا:

اُتْرُکِیْہِ ——— اچھا اسے اب چھوڑ دے۔

ابھی یہ الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اچانک زمین کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور گھوڑے کا پاؤں باہر نکل آیا۔

مال کی طمع بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ بنی نوعِ انسان کو دیدہ و دانستہ فریب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ رہائی پا کر جب سراقہ واپس لوٹ رہے تھے تو تقصیر کی ندامت کے احساس سے دل ڈوبا جا رہا تھا ——— جیسے ہی میل دو میل کی مسافت طے کی ہوگی کہ حرص کا شیطان پھر دل پر مسلط ہو گیا اور فریب کی راہ سے تلقین شروع کی کہ یہ واقعہ یونہی اتفاقاً پیش آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے محمد کی پیغمبرانہ توانائی کا قطعاً کوئی کرشمہ نہیں ہے۔

چلو واپس چلو ——— سرخ اونٹوں کے انعام کا زرّیں موقع ہاتھ سے نہ جانے دو ——— محمد کی گرفتاری کوئی انہونی چیز نہیں ہے۔

دل کی آواز پر پھر سراقہ نے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ اور پھر تعاقب کرتے ہوئے سرکار ﷺ کے قریب پہنچ گئے۔ اس بار بھی لبوں کو جنبش ہوئی۔ دھرتی کا کلیجہ شق ہوا۔ اور سراقہ اپنے گھوڑے سمیت گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔

پھر سراقہ نے رحمتِ اکرم کو آواز دی۔ پھر بخشش و درگزر کو پکارا۔ اور پھر رحمتِ مجسم نے احسان کی بارش کی۔ زمین کو اشارہ کیا اور کائنات گیر اقتدار کی گرفت میں سسکتا ہوا دشمن پھر آزاد ہو گیا۔

اِس بار دل کی گہرائی میں پیغمبر ﷺ کی توانائی کا یقین پیدا ہو چلا تھا۔ بار بار سراقہ سوچ رہے تھے کہ ایک نیازمند کی طرح زمین کی یہ فرماں برداری بلاوجہ نہیں ہے۔ کائنات کے خدا کے ساتھ محمد کا کوئی معنوی تعلق ضرور ہے۔ لیکن نفس کا شیطان بڑا ہی چابکدست اور سحر طراز دشمن ہے۔ یہ ظالم ایک ہی لمحے میں دل کی ساری بساط الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ سراقہ کچھ ہی دُور چلے ہوں گے کہ شیطان نے پھر سرگوشی شروع کی:

"محمد اتنے ہی بڑے صاحبِ اقتدار ہوتے تو ایک تھکے ہوئے مجبور کی طرح مکے سے مدینے کی طرف ہجرت نہ کرتے۔ خیالی ہیبت کے آگے ہتھیار ڈال دینا بہادروں کا شیوہ نہیں ہے ـــــ سُرخ اونٹوں کا انعام تمہاری زندگی کا نقشہ بدل دے گا۔ چلو واپس لوٹو۔ اس سے زیادہ زرّیں لمحہ تمہیں پھر کبھی میسّر نہیں آئے گا"۔

بالآخر سراقہ پھر شیطان کے فریب کا شکار ہو گئے۔ پھر تیزی کے ساتھ لوٹے۔ پھر پیغمبر کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ پھر زمین کا دہانہ کھلا اور سراقہ ایک گرفتار پنچھی کی طرح سسکنے لگے۔ رحمتِ یزدانی نے دوبارہ سراقہ کو موقع دیا تھا کہ وہ سنبھل جائیں۔ لیکن جب بار بار کی تنبیہہ کے بعد بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں تو پیغمبر نے خود حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھایا ـــــ اور دلنواز تبسّم کے ساتھ سراقہ کو مخاطب کیا:

"سُرخ اونٹوں کے فریب میں اُپنے نوشتۂ تقدیر سے کیوں جنگ کر رہے ہو۔ تمہارا مستقبل میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ جس کی زلفوں کا اسیر بن کر جینا مقدر ہے اسی کو گرفتار کرنے آئے ہو؟ کیا اب بھی تمہیں کفر کی شب دیجور کا سویرا نظر نہیں آرہا ہے۔ میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ کسریٰ کے سونے کے کنگن تمہاری کلائیوں میں چمک رہے ہیں۔ وہ دن زیادہ دُور نہیں ہے کہ نصیبے کی ارجمندی تمہیں ایک وارفتہ حال دیوانے کی طرح میرے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ اور تمہارا سینہ اسلام و ایمان کی دولتِ لازوال کا گنجینہ بن

جائے گا"۔

پیغمبر صادق کی زبان حق ترجمان کے نکلے ہوئے یہ الفاظ سراقہ کے دل میں ترازو ہو گئے۔ تاریخ میں عالمی تسخیر کی یہ پہلی خوشخبری تھی جس کے پیچھے کوئی مادی سامان نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ جیسے جابر و عظیم فرماں روا کے کنگن دیکھنے والا۔ آج وطن سے بھی شہر بدر کر دیا گیا تھا۔

(3)

حضرت سراقہ پر جلد ہی صبح سعادت طلوع ہوئی اور وہ مدینے کے دار الامان میں پہنچ گئے۔ اور پروانے کی طرح شمع رسالت کے جلوؤں میں نہاتے رہے۔ کلائیوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن پہننے کا یقین ان کے دل کی دھڑکنوں سے منسلک ہو گیا تھا۔ جس رسول نے جبریل و میکائیل، عرش و کرسی، لوح و قلم، جنت و دوزخ اور حشر و نشر کی خبر دی تھی۔ اسی رسول نے کنگن پہننے کی خوشخبری بھی عطا کی تھی۔ زندگی کے دن اسی انتظار میں گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ خلافتِ فاروقی کے عہدِ زرّیں میں حضرت سراقہ سخت بیمار پڑ گئے۔ علالت سنگین ہو گئی۔ صورتِ حال شہادت دے رہی تھی کہ اَب چند سانسوں کے مہمان رہ گئے۔ اکابر صحابہ بالیں کے قریب جمع ہو گئے۔ عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونے والوں کے نام کچھ لوگ اپنا پیام وسلام کہنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت سراقہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور مسکراتے ہوئے کہا:

"آپ حضرات اطمینان رکھیں، یہ میرا آخری وقت نہیں ہے۔ اس وقت تک موت میرے قریب نہیں آئے گی۔ جب تک کہ میں اَپنے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن نہ پہن لوں۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ٹل سکتی ہے۔ سرکار رسالت ﷺ کا فرمان نہیں ٹل سکتا"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت سراقہ موت کے چنگل سے نکل آئے اور دیکھتے دیکھتے کچھ دنوں میں بالکل صحت یاب ہو گئے۔

(4)

آج مدینے میں ہر طرف مسرّتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سجدۂ شکر کے اضطراب سے

سب کی پیشانیاں بوجھل ہوگئی تھیں۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی لشکر اسلامی کا قاصد فتح ایران کی خوشخبری لے کر آیا تھا۔ محمد عربی کے غلاموں نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو اپنے قدموں سے روند ڈالا تھا۔ آج تاریخ میں پہلی بار کسریٰ کے ایوانوں پر عظمت اسلامی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ حق کی سطوت و جبروت کے آگے باطل اقتدار کا غرور چکنا چور ہوگیا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ایران سے اموال غنیمت سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطار مدینے میں پہنچی۔ کسریٰ کے محل کا ساز و سامان دیکھ کر لوگ دنگ رہ گئے۔ مسجد نبوی کے فرش پر سارا مال غنیمت بکھیر دیا گیا۔

امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے کسریٰ کے کنگن دریافت کیے۔ تلاش کے بعد جب وہ مل گئے تو حضرت سراقہ کو آواز دی گئی۔ اس وقت حضرت سراقہ کا عالم قابل دید تھا۔ ناز سے جھوم رہے تھے۔ فرط مسرّت سے چہرہ کھلا جا رہا تھا۔ ارمانوں کے ہجوم میں مچلتے ہوئے اٹھے اور فاروق اعظم کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

آج حضرت سراقہ کیلئے زندگی کی محبوب ترین گھڑی تھی۔ جس آرزو کو ساری عمر ایمان کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا وہ آنکھوں کے سامنے جلوہ گر تھی۔ اہل مدینہ بھی کیف و مستی کے عالم میں اپنے آقا کا زندہ معجزہ دیکھ رہے تھے۔ امنڈتے ہوئے خوشی کے آنسوؤں میں حضرت فاروق اعظم نے حضرت سراقہ کی کلائیوں میں کسریٰ کے کنگن پہنائے۔ سر پہ تاج رکھا اور شاہی قبا زیب تن کرائی۔ حضرت سراقہ کی شاہانہ سج دھج دیکھ کر اہل مدینہ جذبات سے بے قابو ہوگئے۔ فرطِ شوق میں منہ سے چیخ نکل گئی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی عشق و ایمان کی رقت انگیز کیفیت سے بے خود ہوگئے۔ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اس وقت کی بات ہے جب اسلام بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔ ایک یزدانی مسافر نے آج کی عظیم الشان فتح کی خبر دی تھی —— کل میدان قیامت میں آپ حضرات گواہ رہیئے گا کہ سراقہ کے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن پہنا کر میں نے اپنے آقا کا فرمان پورا کر دیا"۔

سرکارِ رسالت کی شوکتِ اقتدار کا یہ نظارہ تاریخ فراموش نہیں کرے گا کہ ایک جنبشِ لب پہ کائناتِ گیتی کا نقشہ بدل گیا۔ اور عشقِ رسالت کے فیضان نے عرب کے صحرانشینوں کو چشمِ زدن میں ساری دُنیا کا فرماں روا بنا دیا۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

ارشد القادری

کُوچۂ جاناں

عشق کی سرفرازی کا ایک انتہائی رقت انگیز واقعہ

عبداللہ عراق کا مشہور ڈاکو، ہلاکت خیز، غارت گر اور ستم پیشہ قاتل آج ایک خوفناک مہم سے پلٹ کر اَپنے گھر آیا تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ ساتھیوں نے رخصت ہوتے وقت دریافت کیا:

''سردار! دوسری مہم کی تیاری کب تک ہوگی؟''

آج جانے کیا بات تھی کہ اس سوال پر عبداللہ کے چہرے سے خوشی کا کوئی نشان نہیں ظاہر ہوا۔ اس نے نہایت بے دلی سے جواب دیا:

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، تیاریوں کی اطلاع تمہیں وقت سے پہلے دی جائے گی''۔

ساتھیوں کو رخصت کر کے جب وہ اَپنے بستر پہ لیٹا تو ایک نامعلوم کسک سے اُس کا دل بوجھل تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ وہ حیرانی کے عالم میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ غفلتوں کی نیند بہت گہری تھی۔ اس لئے منہ پھیر کر پھر لیٹ گیا۔ لیکن اس مرتبہ دِل کا بند دروازہ نیم باز ہو چکا تھا اور ہاتفِ غیب کی سرگوشیوں کیلئے گنجائش نکل آئی تھی۔

اچانک دل کے روزن سے کوئی بہت دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا:

''ظالم! ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھ! تیرے نامۂ زندگی کا ایک ایک ورق سیاہ ہو چکا ہے۔ مظلوموں کی آہ، بے گناہوں کے خون اور معاصی کے بوجھ تیری مغرور گردن اَب ٹوٹنا ہی چاہتی ہے۔ مرنے کے بعد جب تو ایک باغی مجرم کی طرح خدائے قہار کے سامنے کھڑا کیا جائے گا تو دہشت وجلال سے تیرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ انجام کی رسوائی اور جہنم کے ہولناک

عذاب سے بچنا چاہتا ہے تو اَب بھی وقت ہے۔ اُٹھ! اور اپنے خاکی جسم سے شیطان کا یہ پیراہن اُتار کر پھینک دے۔ مغفرت وکرم کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے جیسے بھی ممکن ہو اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر لے''۔

ہاتف غیب کی یہ خاموش صدا نہایت تیز نشتر کی طرح عبداللہ کے جگر سے پار ہو گئی اور اسے تڑپتے ہوئے بسمل کی طرح گھائل کر گئی۔

اَب دِل کی اندرونی حِس بیدار ہو چکی تھی اور عمر بھر کی کثافتوں کا غُبار آنکھوں کی راہ سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔

اسی عالمِ اضطراب اَپنے بستر سے اُٹھا اور رات کی تاریکی میں اپنے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی جعفر کے گھر گیا۔ عبداللہ کی بے وقت آمد سے جعفر گھبرا اُٹھا۔ اُس نے جلدی میں پوچھا:

''کیا کسی فوری مہم کی تیاری ہے؟''

عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا: ''ہاں! آج زندگی کی سب سے بڑی مہم ہے میرے دوست؟'' اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آج پہلی مرتبہ عبداللہ کو روتا ہوا دیکھ کر جعفر حیران رہ گیا۔

حیرت سے دریافت کیا: ''یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے سردار؟''

ہچکیاں بھرتے ہوئے عبداللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

''جعفر! اس وقت میں ہولناک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوا ہوں۔ اپنی سیہ کار زندگی اور اس کے بھیانک انجام کے تصور سے میرا دِل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدارا بتاؤ کہ ایک باغی مجرم کی طرح عمر کا جو حصہ میں نے گزارا ہے کیا اب کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی ایسی شکل ہے کہ مَیں اَپنے روٹھے ہوئے پروردگار کو راضی کر لوں؟ کیا اُس رحمتِ خاص کا کہیں سُراغ لگ سکتا ہے جس کے تئیں نامۂ عمل کی سیاہی دھونے کیلئے دیدۂ شرمسار کا فقط ایک قطرہ کافی ہے۔

جعفر! میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں، مجھے چراغ دکھاؤ! میں اپنے رب کی طرف

پلٹنا چاہتا ہوں۔ میری راہ نمائی کرو۔ میں گھائل ہو گیا ہوں۔ میرے زخموں کی ٹیس کیلئے کوئی مرہم بتاؤ"۔

اتنا کہتے کہتے عبداللہ کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ چُپ ہو گیا۔

ایک غم گسار چارہ گو کی زباں میں جعفر نے جواب دیا:——

"دل کا یہ رقت انگیز انقلاب اور سوز و کرب کی یہ نئی منزل تمہیں مُبارک ہو سردار! افسوس! کہ تمہاری ہی طرح میں بھی اس کوچے سے ناآشنا ہوں۔ اس لئے باور کرو کہ دل کے ہزار جذبۂ خلوص کے باوجود میں تمہاری کوئی رہ نمائی نہیں کرسکتا۔

البتہ اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ خدا کی تلاش میں نکلنے والے سب سے پہلے کسی مرشدِ کامل کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اُسے پالینے کے بعد خُدا یابی کی منزل بہت قریب ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں خُدا تک باریابی کے لئے یہی ایک راہ اَب تک کھلی ہوئی ہے۔ باقی تمام راستے بند ہیں۔ خُدا کی طرف قدم بڑھانا چاہتے ہو تو تمہارے لئے بھی اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ کسی مرشدِ کامل کا دامن تلاش کرو—— میں نے سُنا ہے کہ مُرشد کامل ہی اس راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہوتا ہے مرشدِ کامل کے بغیر یہ راہ آج تک کسی نے بھی طے نہیں کی ہے عبداللہ!"

جعفر کی اس بات پر عبداللہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کا سوکھا ہوا چہرہ اس طرح کِھل گیا جیسے یاس کی تاریکیوں میں اُسے اُمید کی کوئی کرن نظر آ گئی ہو۔ ایک غم نصیب شکر گزار کی زبان میں اُس نے جعفر کی ہمدردیوں کے جواب میں کہا:——

"میرے دیرینہ ہمدم! تمہاری غمگسار رہنمائی کا شکریہ! تم نے میرے جلتے ہوئے زخموں پر جیسے تسکین کا مرہم رکھ دیا۔ اَب اگرچہ میں مایوس نہیں ہوں لیکن میرے دوست! کسی مرشدِ کامل کی تلاش کا صحیح شعور بھی تو مشکل امر ہے۔ اِس مشکل کو بھی اَب تم ہی آسان کرو۔ تم ہی کسی مرشدِ کامل کا نشان بتاؤ۔ میں اس کی گلی میں سر کے بل جاؤں گا"۔

عبداللہ کے اس سوال پر جعفر ایک شریکِ غم کی طرح پھوٹ پڑا:

"میرے محسن! تم شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ باور کرو! میرے خونِ جگر سے

اگر تمہارے دل کی آگ بجھ سکتی ہے تو میں اس کیلئے بھی اپنے آپ کو تیار پاتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ آگ پانی سے نہیں تجلیات کی خنکی سے بجھتی ہے۔

سردار! تم اس بات سے ناواقف نہیں ہو کہ میرا اور تمہارا ماحول دونوں کا ایک ہی رہا ہے۔ تمہاری ہی طرح میں بھی اُن تمام چشموں سے گریزاں رہا ہوں۔ جہاں خیال وعمل کی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے تمہاری طرح مجھے بھی کسی مرشدِ کامل کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ویسے میرا اپنا خیال ہے کہ مرشدِ کامل کی تلاش بھی خُدا ہی کی تلاش کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس لئے اگر تُم خدا کا نام لے کر اس مہم پر جونکل پڑو تو مجھے یقین ہے کہ خُدا تمہاری ضرور مدد کرے گا۔ یہ راہ طے نہیں کی جاتی ہے سردار! کرائی جاتی ہے"۔

جگر میں ٹیس اَب بھی تھی، لیکن زخموں کی جلن کم ہوگئی تھی۔ یاس کی تاریکیوں میں آنے والا عبداللہ اب اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اُمید کا ایک چراغ بھی تھا۔ جعفر کی بات سُن کر اضطرابِ شوق کے خودفراموش عالم میں عبداللہ اٹھا اور سیدھے اپنے گھر لوٹ آیا۔

رات کافی ڈھل چکی تھی۔ رحمتِ یزدانی کے فرشتے آسمانوں کے دروازے کھول رہے تھے۔ ستاروں کی چاندنی میں اچانک ایک قافلہ نور زمین کی طرف اُترتا ہوا نظر آیا۔ شائد کسی فیروز بخت کی دعا آج شرفِ قبول سے سرفراز ہونے والی تھی۔

عبداللہ اَپنی کوٹھری کے ایک تاریک گوشے میں چھپ کر رو رہا تھا کبھی کبھی ہچکیوں کے درمیان رقت وکرب میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنائی دیتی تھی۔

اے مغفرت وکرم کے والی! ایک شرمسار مجرم کو اپنی رحمت کے وسیع دامن میں پناہ دے دے، اے تیرہ بختوں کی اُمید گاہ! اپنی سیہ کار زندگی سے تائب ہو کر آج مَیں تیری طرف پلٹ رہا ہوں۔ تو اپنی اونچی بارگاہ سے ایک فریادی کی پکار سُن لے۔

اے دل کے ٹوٹے ہوئے آبگینوں کو جوڑنے والے! ہر طرف سے ٹوٹ کر اب تیری راہ میں قدم اُٹھا رہا ہوں۔ بھیج دے کسی مرشدِ کامل کو جو تیری دہلیز تک مجھے پہنچا دے!

بے نیاز مولیٰ! میں تیری عظمت کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روؤں گا، مچل مچل کر

تڑپوں گا اور زار زار فریاد کروں گا یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔

رات پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ جلدی جلدی اس نے دعا تمام کی۔ چاروں طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور اللہ کا نام لے کر گھر سے باہر نکل پڑا۔

حق کی تلاش میں یہ اس کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا۔ گلیوں اور پر پیچ راستوں سے ہوتا ہوا وہ ایک چوراہے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ نامعلوم طور پر دل کے یقین نے نشان دہی کی کہ جہاں وہ کھڑا ہے۔ وہی مرشدِ کامل کی ملاقات کی جگہ ہے۔ انتظار میں کھڑے کھڑے کافی عرصہ بیت گیا۔ ستاروں کی آنکھیں ڈوبنے لگیں۔ اُمید و بیم کی کش مکش کا یہی عالم تھا کہ چند ہی لمحے کے بعد اسے کچھ فاصلے پر حرکت کرتا ہوا ایک سایہ نظر آیا۔ بے ساختہ دل نے آواز دی۔ ''مرشدِ کامل آ رہا ہے'' پابوسی کیلئے شوق کی نگاہ جھکی، عقیدت نے قدم بڑھائے، اُمیدوں نے خیر مقدم کیا اور قریب پہنچ کر اس نے عالمِ بے خودی میں پکارا:

''مرشدِ کامل! میں تمہارا کب سے انتظار کر رہا ہوں، آؤ میرے قریب آؤ! میرے کشورِ دل پر فرماں روائی کرو مجھے مُرید کر لو مجھے بے دام خرید لو۔ میں تمہارے ہاتھ پر اپنی متاعِ ہستی بیچ رہا ہوں مجھے اپنے کاکل و رُخ کا غلام بنا لو۔ میں اپنے نصیب دشمن آزادی تمہارے قدموں پر نثار کرتا ہوں''۔

آنے والے نے حیرانی کے عالم میں جواب دیا ـــــ ''میرے بھائی! میں تمہاری زبان نہیں سمجھ رہا ہوں۔ تم جس کا انتظار کر رہے ہو وہ میں نہیں ہوں۔ میں اندھیری راتوں کا سیاح ہوں۔ مجھے اجازت دو۔ تمہاری اُمیدوں کا مرکز کوئی اور ہوگا''۔

عبد اللہ نے دامن تھامتے ہوئے کہا ـــــ ''میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں اور میری اُمیدوں کا مرکز کون ہے! یہ جاننا تمہارا کام نہیں میرا کام ہے۔ خُدا کے ایک بچھڑے ہوئے بندے کو خدا سے قریب کر دینا تمہاری ہستی کا سب سے اہم فریضہ ہے مرشد! دیر مت کرو۔ مجھے جلد مرید کر لو تا کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تمہاری رہنمائی میں میرے سفر کا دوسرا دور شروع ہو جائے ـــــ''

آنے والے نے ذرا سنجیدہ ہو کر جواب دیا ـــــ ''میرے بھائی! میں کہہ رہا ہوں

کہ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں کیا ہوں اور میرا پیشہ کیا ہے؟ اگر تمہیں معلوم ہو جائے تو تم میرے منہ پر تھوک دو گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ جس مہم پر آج میں اپنے گھر سے نکلا ہوں۔ اب اس کا وقت ختم ہو رہا ہے میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

ہزار انکار کے باوجود عبداللہ اپنی ضد پر قائم تھا اور کسی طرح بھی اس دامن سے الگ ہونے کیلئے تیار نہیں تھا۔

اَب وہ بھی تنگ آچکا تھا اور ایک اجنبی دیوانے سے پیچھا چُھڑانے کا کوئی حیلہ تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اُس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"لو! نہیں مانتے ہو تو میں نے تمہیں مُرید کر لیا۔ اَب آج سے تم میرے ہاتھ پر بِک گئے۔ جس پُر خطر راہ میں تم نے قدم رکھا ہے۔ اُسے سلامتی کے ساتھ طے کرنے کیلئے ضروری ہے کہ تم اَپنے مرشد کی غیر مشروط اطاعت کرو۔ میں تمہیں حُکم دیتا ہے کہ تم یہاں کھڑے رہو، جب تک میں واپس نہ آؤں یہیں کھڑے رہنا۔ یقین رکھو! واپسی کے بعد میں تمہیں وہ راستہ طے کرادوں گا جو بارگاہِ ایزدی کی چوکھٹ تک پہنچاتا ہے اچھا اب اجازت دو"۔

یہ کہتا ہوا وہ جس طرف سے آیا تھا، اسی طرف واپس لوٹ گیا۔ جب تک وہ نظر آتا رہا۔ عبداللہ کی حسرت بھری نگاہیں اس کا قدم چُومتی رہیں۔ صبح ہوگئی اور عبداللہ انتظار میں کھڑا رہا۔ دن چڑھے تک کھڑا ہی رہا۔

شہر کے ایک مشہور شخص کا گھنٹوں ایک جگہ کھڑا رہنا معمولی بات نہیں تھی۔ ہر طرف سے آدمیوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگوں نے ہزار سمجھایا کہ وہ اَپنے گھر واپس چلے، لیکن سب کیلئے اس کے پاس ایک ہی جواب تھا: ——

"میری ہستی کا فرمان روا، میرا مرشد کامل مجھے حکم دے گیا ہے کہ جب تک پلٹ کر نہ آؤں، تم یہیں کھڑے رہنا۔ اب میں اس کی واپسی تک یہاں سے کہیں نہیں ٹل سکتا۔ وہ وعدہ کر گیا ہے کہ مجھے بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچا دے گا"۔

لوگوں نے اصرار کرتے ہوئے کہا: ——— ”رات بھی ختم ہوگئی۔ اب دن کا آخری حصہ گزر رہا ہے۔ اُسے واپس آنا ہوتا تو اب تک آ گیا ہوتا۔ اب اس کا انتظار بے سُود ہے۔ اس نے تم سے جُھوٹا وعدہ کیا ہے“۔

عبداللہ نے یقین کے تیور میں شرابور ہو کر جواب دیا ——— ”اپنی زبان کو آلودۂ گناہ مت کرو۔ مرشدِ کامل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔ دمِ رخصت اس نے کسی وقت کا تعین نہیں کیا تھا، اس لئے اس کی واپسی کی میعاد صبحِ محشر تک ہے۔ تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں عمر کے آخری لمحے تک اسی کا انتظار کروں گا“۔

دنیا کی ہر چیز حرکت میں تھی۔ وقت کا قافلہ بھی رواں دواں تھا۔ کتنی شام آئی اور گزر گئی، کتنے سورج نکلے اور ڈوب گئے۔ لیکن عبداللہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ اَب وہ علاقے کا قابلِ نفرت جرائم پیشہ نہیں تھا، عقیدت کیش نگاہوں کا تماشا بن چکا تھا۔ ہزاروں شیدائی ہر وقت اُسے اَپنے جُھرمٹ میں لیئے رہتے تھے۔ مرشدِ کامل کا انتظار اب تنہا اسی کو نہیں تھا، دیوانوں کی ایک بہت بڑی جماعت اس کے شریکِ حال ہوگئی تھی۔

چاندنی رات تھی۔ پچھلا پہر تھا۔ ساری آبادی پر خموشی طاری تھی۔ تماشائی بھی غنودگی کے عالم میں تھے۔ لیکن عبداللہ بدستور کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں انتظار میں کُھلی ہوئی تھی۔ اچانک اسے کسی آنے والے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو سامنے ایک سفید پوش بزرگ لمبی عبا پہنے، ہاتھ میں عصا لئے کھڑے تھے۔

نگاہوں کا جلال، پیشانی کی طلعت، اور چہرے سے برستا ہوا نُور نشان دہی کر رہا تھا کہ انسانی پیکر میں کوئی فرشتہ اُتر آیا ہے۔ عظمتِ خُداداد کی دھمک سے عبداللہ کی آنکھیں جُھک گئیں۔ دِل ایک نامعلوم ہیبت سے مرعوب ہوگیا۔

نووارد بزرگ نے پُرشکوہ لہجے میں دریافت کیا ——— ”تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

آنکھیں نیچی کیے ہوئے عبداللہ نے جواب دیا ——— ”مرشدِ کامل کے انتظار میں“۔

نووارد بزرگ نے پھر سوال کیا ——— ”کون مرشدِ کامل“؟

عبداللہ نے ہمّت سے کام لیتے ہوئے کہا —— "وہی مرشدِ کامل جس کے ہاتھ پر میں مُرید ہو چکا ہوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم یہیں میرا انتظار کرو۔ میں واپس ہونے کے بعد تمہیں بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچا دوں گا"۔

نو وارد بزرگ نے فہمائش کے انداز میں ارشاد فرمایا —— "میرے عزیز! وہ مرشدِ کامل نہیں ہے۔ اندھیری راتوں کا سیّاح ہے۔ بارگاہِ یزدانی کا راستہ اسے خود نہیں معلوم، وہ تمہاری کیا رہنمائی کرے گا۔ اب وہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔ بلا وجہ اس کے انتظار میں اپنی جان مت ہلاک کرو"۔

عبداللہ نے اصرار کرتے ہوئے جواب دیا —— "میرے دل کا یہ یقین کسی طرح متزلزل نہیں ہو سکتا کہ وہ ضرور واپس آئے گا اور اسے بارگاہ یزدانی کا راستہ قطعاً معلوم ہے۔ مرشدِ کامل کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا"۔

نو وارد بزرگ نے تنبیہ کے لہجے میں فرمایا —— "ایک غلط بات پر اصرار مت کرو۔ تم سخت قسم کے فریب میں مبتلا ہو۔ اپنی نادانی سے ایک چور کو تم نے مرشدِ کامل سمجھ لیا ہے۔ سوتے ہوئے انسانوں کی آنکھوں سے کاجل چُرانے والا بھی اگر مرشدِ کامل ہو سکتا ہے تو شامت کی ماری ہوئی دُنیا کو اَب مرشدِ کامل کی کوئی احتیاج نہیں ہے —— افسوس تمہاری ناسمجھی پر!"

اَب عبداللہ کا پیمانۂ ضبط لبریز ہو چکا تھا۔ مرشد کے خلاف الفاظ کا نشتر برداشت نہ ہو سکا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہچکیوں پر قابو پانے کے بعد اس نے درد و کرب کی آگ میں سلگتے ہوئے کہا —— مجھے سخت افسوس ہے کہ ایک طرف تو آپ سراپا، دلوں پر ملکوتی اثر ڈال رہا ہے اور دوسری طرف آپ مرشدِ کامل کی مذمت کر رہے ہیں۔ اتنا مقدس ہو کر آپ کا یہ انداز سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ گستاخی نہ ہو تو آپ کا نام نامی اسمِ گرامی معلوم کرنے کا اعزاز حاصل کر سکتا ہوں؟

نو وارد بزرگ نے مسکراتے ہوئے فرمایا —— "میرا نام معلوم کر کے اگر تمہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو سُن لو کہ مجھے خضر کہتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہِ راست پر لانا

میرے منصب کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اسی رشتے سے میں نے تمہاری فہمائش کی ہے"۔
نام سنتے ہی عبداللہ نے جھک کر قدموں کا بوسہ لیا۔ عبا کا دامن آنکھوں سے لگایا اور فرطِ ادب سے کانپتے ہوئے کہا:——
" آج میں اپنی خوش نصیبی پر جس قدر بھی ناز کروں کم ہے کہ وہ خواجۂ حق نما جس کے دیدار کی تمنا میں بڑے بڑوں کی آنکھیں فرشِ راہ رہا کرتی ہیں، آج بغیر کسی زحمتِ التجا کے اس حیرت نصیب جلوؤں سے میری نگاہیں سیراب ہو رہی ہیں۔
اس کے ساتھ ہی یہ عرض کرنے کی بھی اجازت دی جائے کہ جس مرشدِ کامل کو چور کہا جا رہا ہے اس سے مرید ہونے کے بعد ہی مجھے یہ شرف حاصل ہوا ہے۔ اُس "چور" کی نسبت کا یہ اعزاز کیا میرے لئے قابلِ فخر نہیں ہے۔ زہے نصیب! کہ آپ کی تشریف ارزانی سے مرشدِ کامل پر میرا یقین اور پختہ ہو گیا"۔
حضرتِ خضر نے کریمانہ انداز میں ارشاد فرمایا —— پھر تم نے اسی غلطی کا اعادہ کیا، میں مرشدِ کامل کو چور نہیں بنا رہا ہوں، تم نے ایک چور کو مرشدِ کامل بنا لیا ہے۔ البتہ اب مشیت کا کچھ ایسا انداز معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری ضد پر "چور" ہی کو مرشدِ کامل بنا دیا جائے گا۔ طلبِ صادق کا یہ جنون اور جذبِ عشق کا یہ ولولہ شیطان کے دست بُرد سے محفوظ رہ گیا تو یہ بشارت سن لو کہ اسی جگہ مرشدِ کامل سے تمہاری ملاقات ہوگی اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد تم بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ پر خلعتِ عرفان سے سرفراز کیے جاؤ گے۔
انتظار کرو! اس ساعت جاں افروز کا جب تمہارے دل کی سرزمین پر تجلیاتِ الٰہی کا عرش بچھایا جائے گا۔ خدائے قادر تمہارے حوصلۂ جنوں انگیز کی حفاظت فرمائے"۔
یہ کہتے ہوئے حضرت خضر واپس پلٹے اور دو قدم چل کر نگاہوں سے غائب ہو گئے۔
تھوڑی دیر کے بعد سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور عبداللہ کے نصیبے کی رات کی تاریکی چھٹنے لگی۔ آج عرصۂ دراز کے بعد عبداللہ کو ذرا سی نیند آئی تھی۔ آنکھ لگتے ہی اس نے دیکھا کہ کارکنان قضا و قدر عرشِ الٰہی کے سائے میں کھڑے ہیں۔ ناگہاں حجابِ عظمت سے ایک آواز آئی اور فرشتے ہیبتِ جلال سے سجدہ ریز ہو گئے۔

غالباً قلوب کی باگ ڈور ہاتھ میں رکھنے والے فرشتے کو کچھ احکام سپرد کئے گئے تھے اتنے میں پاس ہی کی مسجد سے اذان کی آواز نے عبداللہ کو جگا دیا۔

اندھیری راتوں کا سیاح، یا عبداللہ کا مرشدِ کامل، جس کا نام یحیٰی تھا۔ آج بے حد مسرور تھا۔ بغداد عروس البلاد کے متعلق بہت ساری روایتیں اس نے سنی تھیں۔ بہت دنوں سے اسے اشتیاق تھا کہ ایک بار اس دولت مند شہر میں چل کر قسمت آزمائی کی جائے۔ آج چند حوصلہ مند ساتھیوں کی مدد سے بغداد کی مہم کا پروگرام طے پا گیا تھا۔ مشورے کے مطابق صبح تڑکے بغداد کیلئے روانگی تھی۔ اس لئے رات ہی کو تمام ساتھی ایک جگہ جمع ہو گئے اور پو پھٹتے ہی اندھیری رات کے سیاحوں کا یہ دستہ بغداد کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیسے جیسے بغداد قریب آتا جا رہا تھا۔ نامعلوم طور پر یحیٰی کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی اس بے چینی کا اس نے ساتھیوں سے کئی بار ذکر بھی کیا، لیکن انہوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کئی دن شب و روز چلنے کے بعد یہ معلوم کر کے سب کو خوشی ہوئی کہ اب بغداد صرف ایک منزل کی مسافت پر رہ گیا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی آخری کرنیں پہاڑوں پر چمک رہی تھی۔ ایک وادی کے نشیب سے گزرتے ہوئے جیسے وہ بلندی پر چڑھے، سامنے بغداد کا حسین شہر جھلک رہا تھا۔ منزل مقصود پر نظر پڑتے ہی روح مسکرائی اور دل جھوم اُٹھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اب یہ دستہ بغداد کے شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک وسیع شاہراہ سے گزرتے ہوئے ایک عالی شان عمارت نظر آئی۔ دروازے پر سواریوں کا ہجوم گھوڑوں کی قطار اور اونٹوں کی بھیڑ دیکھ کر یحیٰی (عبداللہ کا مرشدِ کامل) چلتے چلتے رُک گیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا کہ یہ شہر کے کسی بڑے رئیس کا گھر ہے۔ پاس ہی کھڑے ہوئے ایک راہ گیر سے دریافت کیا:—

''کیا یہ شہر کے کسی بڑے رئیس کا گھر ہے؟''

اس نے جواب دیا —— ''صرف شہر ہی کا نہیں روئے زمین کے سب سے بڑے

رئیس کا گھر ہے یہ، آج تک اس کے خزانے کی کوئی تھاہ نہیں پا سکا۔ اس کے قدموں کے نیچے سونے اور جواہرات کے کان بچھے رہتے ہیں ہفت اقلیم کی پادشاہی اس کے گھر کی ایک معمولی کنیز ہے۔ ہواؤں، دریاؤں، صحراؤں اور پہاڑوں پر ہر جگہ اس کی شوکتِ اقتدار کا پرچم گڑا ہوا ہے''۔

راہ گیر کی یہ بات سن کر اس کا دماغ ایک نامعلوم ہیبت سے مرعوب ہو گیا۔ فرطِ حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا ہو سکے:——

''اس رئیس کا نام کیا ہے؟''

''ایک نام ہو تو کوئی بتائے بھی۔ بے شمار نام ہیں اس کے —— دست گیر کونین، شیخ الثقلین، خواجۂ کائنات، سلطان الاقطاب، مخدوم الوریٰ، غوث الاعظم، امامِ اعظم، امام جیلانی، محبوب سبحانی، یہ، اور اسی طرح کے ناموں کا ایک زرّیں سلسلہ اس کی ذات سے منسوب ہے'' —— راہ گیر نے جلدی میں جواب دیا اور ایک لحظہ رُکے بغیر آگے بڑھ گیا۔

یحییٰ نے فاتحانہ انداز میں اپنے ساتھیوں سے کہا —— ''معلوم ہوتا ہے آج قسمت کا ستارہ اوج پر ہے۔ اتنے بڑے دولت مند کے گھر کا غبار ہی ہاتھ آ گیا تو عمر بھر کیلئے کافی ہے'' آدھی رات تک غور و فکر کے بعد ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ یحییٰ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ سب کے فرائض تقسیم کر دیئے۔

آج جانے کیا بات تھی کہ غوث الوریٰ کی خانقاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ رات کافی ڈھل چکی تھی۔ سارا بغداد نیند کی خموشی میں شرابور تھا۔ کہیں کہیں سے رات کے پاسبانوں کی آواز کانوں میں آ رہی تھی۔ یحییٰ دبے پاؤں خانقاہ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ ہمت کر کے اندر داخل ہوا۔

اندھیرے میں دیر تک اِدھر اُدھر ٹٹولتا رہا، لیکن کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی۔ سخت حیران تھا کہ اتنے بڑے رئیس کا گھر اور بالکل خالی۔ ناکامی کی حسرت کے ساتھ واپس ہوتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ اس گھر کا غبار ہی لیتے چلیں ممکن ہے اس میں سونے اور جواہرات کی راکھ چھپی ہو۔

چاروں طرف سے گرد و غبار جمع کر کے ایک چھوٹی سی گٹھری بنائی اور لے کر جونہی دروازے سے باہر قدم نکالا کہ اچانک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دو چار بار پلک جھپکا نے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ آنکھوں کی روشنی زائل ہو چکی ہے۔ گھبرا کر بیٹھ گیا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمّت جواب دے چکی تھی۔ اتنے میں قریب ہی سے پاسبانوں کی آواز کان میں آئی، گھبرا کر پھر گھر کے اندر پلٹ آیا اور ایک کونے کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا۔

کونین کا دستگیر اور ثقلین کا غوث تہجد کی نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ عارضِ تاباں سے نُور کی کرن پھوٹ رہی تھی۔ پیشانی کی موجوں میں کرن لہرا رہا تھا۔ آنکھوں سے تجلیّات کے چشمے اُبل رہے تھے اور دِل کی شمعِ فروزاں اقلیم ولایت کے نگار خانوں کو چمکا رہی تھی۔

سَامنے رجال الغیب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ایک نقیب نے آگے بڑھ کر عرض کیا:

''عالم پناہ! فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہو گیا ہے''۔

زبانِ حق ترجمان سے مغفرت و رحمت کی دعا دیتے ہوئے سرکار غوث الوریٰ آگے بڑھ گئے۔

اچانک کِسی کے قدموں کی آہٹ پا کر یحییٰ کانپ اُٹھا، بھاگنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کچھ سوچ کر وہیں بیٹھ گیا۔

''آج میرے گھر کون مہمان ہے؟''

کِشورِ دل کو فتح کر لینے والی ایک آواز کان میں آئی۔ اُمید و بیم کی کش مکش میں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک اقبالی مجرم کی طرح بہ مشکل تمام یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے:

''سرکار! میں ہوں ایک شامت نصیب! اندھیری راتوں کا سیّاح!! دولتِ خُداداد کی شہرت سُن کر یہاں آیا تھا۔ لیکن مصیبت کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اَب زندگی کا سب سے بڑا ماتم یہ ہے کہ یہاں آ کر اپنی آنکھوں کی بینائی کھو بیٹھا ہوں۔ آہ! روئے زمین کے سب سے بڑے رئیس کے گھر کتنی اُمیدیں لے کر آیا تھا۔ اب کون جانے، قسمت کا کیا انجام ہو گا''۔ اتنا کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''روؤ مت! کرم کا آبگینہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے گھائل ہو جاتا ہے۔

لو! میرے دامن میں اپنی بھیگی پلکوں کا آنسو جذب کرلو۔ یہ مایوس اُمیدوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں مجرم کو سزا نہیں دی جاتی۔ دل کی تطہیر کی جاتی ہے۔ اپنی ناکامی کا افسوس دل سے نکال دو۔ میری چوکھٹ کا اُمیدوار آج تک خالی ہاتھ نہیں واپس لوٹا ہے۔ صبر سے کام لو۔ آنکھوں کی روشنی نفع کے ساتھ واپس ہوگی''۔

یہ فرماتے ہوئے سرکار غوث الوریٰ اس کے بالکل قریب ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے کرم کی ایک نگاہ کارساز اُٹھی اَور اس کی بے نُور آنکھوں کی راہ سے دل تک پہنچ گئی۔ بس اَب کیا تھا۔ آن کی آن میں عرفان کے سارے لطائف کُھل گئے اور اب پلک جھپکی تو وہ عالمِ ناسوت کی آخری سرحد پر کھڑا تھا۔ اَب ہر طرف تجلّیات کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے فروزاں تھا۔ اب وہ اندھیری راتوں کا سیّاح نہیں تھا۔ ولایت کا اقلیم کا تاجدار بن چکا تھا۔

غوث الوریٰ کی سرکار سے حُکم صادر ہوا ——— ''ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ فلاں شہر کے ابدال کا انتقال ہوگیا ہے۔ آج سے اس کی جگہ پر تمہیں بحال کیا جاتا ہے۔ فوراً وہاں پہنچ کر اپنے منصب کے فرائض سنبھال لو!''

ایک اتھاہ جذبۂ عقیدت کے ساتھ جُھک کر اُس نے سرکار کی پائے گاہ کو بوسہ دیا اور اُلٹے پاؤں واپس لوٹا ———۔

دروازے تک پہنچ کر قدم باہر نکالنا ہی چاہتا تھا کہ رجال الغیب کے مجمع سے آواز آئی:
''آخر ایک دیوانے کی ضد نے چور کو ''مرشدِ کامل'' بنا ہی دیا۔

پھر اُسی شاہراہ سے وہ گزر رہا تھا جس پر چل کر وہ عرفانِ حقیقت کے بحرِ ذخّار تک پہنچا تھا۔ لیکن اب قدموں کے نیچے فرشِ زمین نہیں، کائنات کا دل بچھا جا رہا تھا۔ جس راہ سے گزرتا گیا، آنکھوں کے پیمانے سے قادری میکدے کی شراب ٹپکتی گئی۔ دن چڑھتے چڑھتے اس نے کئی روز کی مسافت طے کر لی تھی۔ اب وہ اَپنی ولایت کی قلمرو میں داخل ہو چکا تھا۔ چند ہی قدم کے بعد شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ آبادی کے ایک چوراہے پر ہزاروں آدمیوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ ایک اجنبی راہ گیر سمجھ کر لوگوں نے اس کی رہ نمائی کرتے ہوئے کہا: ———

''اژدہام کے باعث ادھر سے آمد و رفت کا راستہ بند ہے۔ آپ کسی اور طرف سے جائیے''۔ یحییٰ نے لوگوں سے پوچھا: معاملہ کیا ہے؟ لوگوں نے حیرت آمیز لہجے میں جواب دیا ـــــ کئی ہفتے ہو گئے اس واقعے کو! سارا علاقہ ہل گیا ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے!''

یحییٰ نے کہا ـــــ ''میں اس علاقے کا باشندہ نہیں ہوں۔ مجھے اصل واقعہ سے آگاہ کیا جائے''۔

لوگوں نے بتایا کہ ـــــ ''ہمارے شہر کا ایک اچھا خاصا آدمی کئی ہفتے سے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اسی چوراہے پر رات دن کھڑا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ـــــ ''میں مرشدِ کامل کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں۔ وہ مجھ سے وعدہ کر گیا ہے کہ تم یہیں میرا انتظار کرو، میں واپس ہونے کے بعد بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ تک تمہیں پہنچا دوں گا''۔

ہزار اسے سمجھایا جاتا ہے کہ اَب وہ نہیں آئے گا۔ اس کا انتظار بے سود ہے۔ لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔ سب کو یہی جواب دیتا ہے کہ مرشدِ کامل جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔

دِلوں کا میلان اس کی طرف اتنا بڑھ گیا ہے کہ اب وہ اکیلا نہیں رہتا۔ اس کے اِردگرد ہر وقت پروانوں کا ایک جمگھٹ لگا رہتا ہے''۔

لوگوں کی باتیں سُن کر دفعتاً اس کا حافظہ تازہ ہو گیا اور اچانک اُس رات کا سارا واقعہ نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ اَب غور سے دیکھا تو وہی چوراہا تھا جہاں ایک دیوانے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے ہاتھ پکڑ کر اُسے مُرید کیا تھا۔ اور اپنی واپسی تک وہیں انتظار کرنے کا اُسے حُکم دے گیا تھا۔

یہ سارا واقعہ یاد آتے ہی وہ بے خود ہو گیا۔ جذبات تابِ ضبط سے باہر ہو گئے۔ وارفتگیِ شوق میں دامن پھاڑتا، شور مچاتا مجمع کی طرف دوڑا اور ہجوم کو چیرتا پھاڑتا عبداللہ کے قریب پہنچ کر آواز دی: ـــــ

''میں آ گیا، میں آ گیا! میرے مُرید! مَیں اپنا وعدہ پُورا کرنے آ گیا!''

جانی پہچانی آواز سُن کر عبداللہ چونک پڑا۔ جونہی چہرے پر نظر پڑی، بیساختہ چیخ اُٹھا:

''مرشدِ کامل آ گیا: مرشدِ کامل آ گیا!! مَیں کہہ رہا تھا کہ مرشدِ کامل جھوٹ نہیں بولتا۔ وہ ضرور آئے گا!''

یہ کہتا ہوا بے خودی میں تڑپا اور مرشدِ کامل کے سینے سے لپٹ گیا۔

ایک بہت دنوں کی پیاسی رُوح چشمۂ عرفان سے سیراب ہو رہی تھی اور تجلیات کا ایک نیا عالم نگاہوں کے سامنے چمک رہا تھا۔

سینے سے لپٹے ہوئے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مرشدِ کامل نے آواز دی:

——''عبداللہ! آنکھیں کھولو! تم بارگاہِ یزدانی کی چوکھٹ تک پہنچ گئے''۔

آنکھ کھولتے ہی عبداللہ سجدے میں گر پڑا۔ ہاتفِ غیب نے آواز دی: ——

''آخر ایک بندۂ گنہ گار نے عشق کی آہ وزاری اور فریاد کی سوز و تپش سے اَپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو راضی کر ہی لیا''۔

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

ارشد القادری

ایک مردِ مجاہد کا حیرت انگیز کارنامہ

دو جہان کا فاتح

امام سیوطی علیہ الرحمۃ کی ''شفاء الصدور'' سے

ایک مجاہد کی زندگی کا یہ رُخ بھی کتنا عجیب و غریب ہے کہ ساری دنیا جینے کے اسباب فراہم کرتی ہے اور وہ موت کیلئے میدانوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

کئی سو برس کا عرصہ گذرا ملک شام کی ایک سرسبز و شاداب پہاڑی کے دامن میں اسی طرح کے تین مجاہد رہا کرتے تھے۔

یہ تینوں سگے بھائی تھے جو تلواروں کے سایے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ شباب کی اُمنگوں کے دن تھے۔ زندگی کی بہاروں کا موسم تھا لیکن ''دل دیوانہ'' کا حال کیا پوچھتے ہیں؟ اس کا عالم ہی ساری دنیا سے نرالا ہے۔

کوئی پھولوں کی انجمن میں لذت حاصل کرتا ہے یہ ظالم کانٹوں پہ چل کر خوش ہوتا ہے۔ کسی کی رات نیند کی سرمستیوں میں بسر ہوتی ہے اور اُسے تا دم سحر آنکھ پھوڑنے ہی میں مزہ ملتا ہے۔

اِتفاق کی بات ہے کہ تینوں بھائیوں کے سینے میں یہی ''دل دیوانہ'' تھا۔ دیوانگی زلفِ لیلیٰ کی نہیں تھی، دین کے اعزاز و سربلندی کی تھی، شہادت و سرفروشی کی تھی، رضائے مولیٰ اور خوشنودیٔ حق کی تھی۔ اس آرزو کی تھی کہ خون کا آخری قطرہ دے کر بھی اگر سرکار ﷺ راضی ہو جائیں تو یہ سودا، گراں نہیں ہے۔ ساری متاعِ ہستی لٹا کر بھی اگر نجات کا پروانہ مل جائے تو یہ زندگی کی سب سے بڑی منفعت ہے۔

اسی جذبے میں تینوں بھائی اپنے گھر سے نکلے۔ ہمراہ جینے کا سامان کم مرنے کا سامان زیادہ تھا۔ ہاتھ میں تلوار، سر پہ کفن، بازو میں کمان، پیٹھ پر ترکش اور دل میں شہادت کی امنگوں کا چشمہ ابل رہا تھا۔

آرزوئے مقصود کی تلاش میں شبانہ روز چلتے رہے۔ منزلوں پہ منزلیں بدلتی رہیں۔ لیکن شوق کا طوفان اپنی جگہ بدستور امنڈتا رہا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی آخری کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں سے رخصت ہو رہی تھیں شفق کے دامن میں لالہ کی سرخی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے مسافر اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف پلٹ رہے تھے۔ شام کی سیاہی گیسوئے جاناں کی طرح ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔

اور تین جانوں کا یہ مختصر سا قافلہ ایک پہاڑ کے دامن سے گذرتے ہوئے کسی ہموار زمین کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ لیٹ کر تکان دور کی جائے بلکہ اس لئے کہ مالک بے نیاز کے سامنے بندگی کا ماتھا ٹیک کر دل کی پیاس بجھائی جائے۔

کافی دیر کے بعد کچھ ہی بلندی پر ایک ہموار چٹان نظر آئی۔ آسمان پر کمند ڈالنے والوں کیلئے وہاں تک پہنچنا کیا مشکل تھا؟ نہایت تیزی کے ساتھ تینوں اس پر چڑھ گئے اب نماز کی تیاری شروع ہوگئی۔ چھوٹا بھائی جونہی اذان دینے کیلئے کھڑا ہوا کہ قریب ہی کہیں سے اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کی پُر جلال آواز کان میں آئی۔

یہ آواز سنتے ہی بڑا بھائی وارفتگی شوق کی بیخودی میں اُچھل پڑا۔ بیساختہ منہ سے آواز نکلی۔ ہماری بیتاب آرزوؤں کا سراغ مل گیا۔ اَب ہماری محنت سفر وصول ہو جائے گی۔ منزل مقصود قریب آگئی ہے شاید!

''بھائی جان! آپ کا مطلب ہم نہیں سمجھ سکے! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آذان کی یہ آواز کہاں سے آرہی ہے''؟

چھوٹے بھائی نے اچنبھے کے ساتھ دریافت کیا۔

''میرے عزیز! یہ مجاہدین اسلام کا وہی لشکر معلوم ہوتا ہے جس میں شریک ہونے کی

تمنا ہمیں یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ کہسار کی وادیوں میں سوائے مجاہدین کے اور کون نمازوں کی قطار کھڑی کر سکتا ہے۔ غالباً اسی پہاڑ کی دوسری جانب سے یہ آواز سُنائی دے رہی ہے۔ وقت جارہا ہے۔ آؤ، پہلے نماز پڑھ لیں۔ اس کے بعد سراغ لگائیں گے۔

بڑے بھائی نے مشفقانہ انداز میں جواب دیا:

چھوٹے بھائی نے نہایت پر شکوہ اور دردناک لہجے میں اذان دی۔ اس کے بعد جماعت کے ساتھ نماز ادا کی گئی۔ سنن ونوافل سے فارغ ہو کر تینوں بھائی پہاڑ کے نیچے نیچے لشکر کی تلاش میں نکلے۔ چاندنی رات تھی اس لئے پہاڑی راستہ طے کرتے ہوئے انہیں کوئی زحمت نہیں پیش آئی۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد قریب ہی سے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز سنائی دی۔ تینوں بھائی سنبھل کر کھڑے ہوگئے۔ نظر اٹھائی تو سامنے دو عربی سوار آتے ہوئے دکھائی پڑے۔ قریب پہنچ کر دونوں نے بلند آواز سے کہا:

''اسلام علیکم!''

بھائیوں نے جواب دیا۔ ''وعلیکم اسلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔''

''کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں، کہاں جانا چاہتے ہیں؟''——عربی سوار نے نہایت لجاجت کے ساتھ سوال کیا۔

''ہم لوگ ملک شام سے آرہے ہیں۔ خدا کی راہ میں گھائل ہو کر جان دینے کی آرزو یہاں تک کھینچ کر لائی ہے۔ میدان کارزار کی طرف جانے والے قافلے کی تلاش میں صحراؤں، بیابانوں، اور ویرانوں کی خاک چھانتے ہوئے کتنے ہی دن بیت گئے۔ ابھی مغرب کے وقت پہاڑ کی دوسری جانب سے آذان کی آواز سن کر دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو قریب ہی کہیں اسلامی لشکر کا پڑاؤ ہے۔ اسی سراغ میں جارہے تھے کہ آپ حضرات سے ملاقات ہوگئی——''

خوش آمدید کہتے ہوئے عربی سوار گھوڑے سے اتر پڑے۔ اسلامی تہذیب کے مطابق معانقہ اور مصافحہ سے فارغ ہو کر انہوں نے کہا کہ آذان ہی کی آواز سن کر ہم بھی اسی غرض سے نکلے تھے۔

آپ حضرات کی مجاہدانہ امنگوں سے ہمارے حوصلوں میں نئی جان پیدا ہوگئی۔ خدا ہر مسلمان نوجوان کو ایسا ہی جذبۂ سرفروش عطا فرمائے۔ دلوں کی یہی تپش اسلام کی نبض کو متحرک رکھتی ہے۔ جس ملت میں آپ جیسے کافر شکن مجاہد موجود ہوں۔ اس کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوسکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ روم کی سرحد پر ایک بڑا ہولناک معرکہ پیش آنے والا ہے۔ مسیحی قوم کی ساری طاقتیں چاروں طرف سے سمٹتی آرہی ہیں۔ کلمۂ اسلام کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے عیسائی دنیا کے سارے سورما سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔

"چالیس ہزار تیغ زن مجاہدین پر مشتمل ہمارا لشکر اسی پہاڑ کے عقب میں ٹھہرا ہوا ہے۔ آج ہی رات کو پچھلے پہر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہو جائے گا"۔

عربی سواروں کی زبان سے یہ خبر سن کر تینوں بھائی فرطِ شوق میں جھوم اٹھے، کوثر کی شراب کا نشہ آنکھوں میں اتر آیا اور شہادت کی خوابیدہ امنگیں انگڑائی لیکر بیدار ہوگئیں۔

سرداروں کی رہنمائی میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جونہی وہ اسلامی لشکر کے قریب پہنچے بیساختہ منہ سے نعرۂ تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ لشکر نے بھی نعرے کا جواب پرجوش نعرے سے دیا۔

تین نئے مجاہدین کی آمد پر سارے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی سب نے قدموں کے نیچے اپنے دلوں کا فرش بچھا دیا۔ سپہ سالار نے انہیں سینے سے لگایا، دعائیں دیں اور دینی ولولوں کی تپش معلوم کرنے کے مبارکباد پیش کی۔

رات کے پچھلے پہر تہجد کی نماز سے فارغ ہوتے ہی کوچ کا اعلان ہوا۔ اور دم کے دم میں کہسار کی وادیاں خالی ہوگئیں۔

دریاؤں، پہاڑوں اور صحراؤں کو عبور کرتا ہوا اسلامی لشکر بڑی سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہیبت جلال سے دھرتی کا سینہ دہلنے لگا —— کائنات کی سب سے بڑی طاقت آج حرکت میں آگئی تھی۔ اسلام کی غیرت نے ایک ایسی انگڑائی لی تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔

شبانہ روز چلتے چلتے روم کی سرحد کا فاصلہ جب چند میل رہ گیا تو حالات کا جائزہ لینے کے لئے سپہ سالار لشکر نے پڑاؤ کا حکم دیا۔ دشمن کی نقل وحرکت کا سراغ لگانے اور جنگی خبریں حاصل کرنے کے لئے پچاس مجاہدین پر مشتمل جو دستہ تیار کیا گیا اس میں تینوں بھائی بھی شامل تھے کیونکہ انہیں پہلے سے روم کے متعلق پوری واقفیت حاصل تھی۔

یہ چھوٹا سا دستہ پہاڑوں اور جنگلوں کے محفوظ مقامات سے گزرتا ہوا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک رومیوں کے ایک لشکر سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوگئیں، نیزے جنبش میں آگئے، مٹھی بھر مجاہدین کا یہ دستہ رومیوں کے ٹڈی دل لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ تینوں بھائی بجلی کی طرح کوندتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ قلب لشکر تک پہنچ کر وہ رومی سپہ سالار کا حلقہ توڑنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے کسی نے کمند پھینک کر انہیں گرفتار کر لیا —— لڑائی ختم ہونے کے بعد انہیں جنگی قیدیوں کی طرح پابجولاں رومی اپنے ہمراہ لے گئے۔

اس واقعہ سے اسلامی لشکر کی کچھ ایسی دھاک دشمن کے دل پر بیٹھ گئی کہ وہ جنگ کرنے کے ارادے سے دستبردار ہوگئے۔ بالآخر کئی ہفتے قیام کرنے کے بعد اسلامی لشکر کو حجاز کی طرف واپس لوٹ آنا پڑا۔

آج تین مسلمان قیدیوں کے فیصلے کا دن تھا۔ روم کا عیسائی بادشاہ جونہی دربار میں آکر بیٹھا جلاد نے تینوں کو لاکر سامنے کھڑا کر دیا۔ تینوں بھائیوں کے چہرے پر دہشت ورنج کا مطلق کوئی اثر نہیں تھا۔ انجام کی فکر سے بے پروا، وہ مطمئن کھڑے تھے۔

بادشاہ نے ان سے گرجدار آواز میں کہا: ——

"تم ہمارے ملک پر حملہ کرنے آئے تھے، لیکن قبل اس کے کہ تمہارا خوفناک منصوبہ پورا ہو تم گرفتار کر لئے گئے۔ اب اس جرم کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے —— لیکن تمہارے خوشنما چہروں اور حسین جوانیوں پر مجھے ترس آرہا ہے۔ ایک شرط مان لو تو تمہاری جان بخشی ہوسکتی ہے۔ جان بخشی ہی نہیں، شاہی دربار کا بڑے سے بڑا اعزاز تمہیں مل سکتا ہے"۔

بڑے بھائی نے بھرپور شان بے نیاز کے ساتھ دریافت کیا:——

"وہ شرط کیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا:——"بہت معمولی شرط۔ صرف اپنا مذہب تبدیل کر دو، اسلام کو چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لو"۔

"شرط زندگی کو تم معمولی سی شرط کہتے ہو۔ تلواروں کی نوک پر سر لئے ہوئے جس مذہب کی اشاعت کا عزم رکھتے ہیں، اسے بھی کہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ جس موت کی تو نے دھمکی دی ہے۔ شائد تجھے نہیں معلوم کہ اس کی تلاش میں گھر سے نکلے ہوئے ایک عرصہ بیت گیا کافی سختیاں جھیلنے کے بعد ایک میدان ہاتھ آیا بھی تھا، شاید مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہم گرفتار کر لئے گئے۔ قافلۂ حیات کی منزل تختِ سلطان نہیں ہے، اس کا سانچہ تو ہمارے قدموں کی ہر ٹھوکر پر بنتا اور بگڑتا ہے۔ ہماری سرگرمیوں کا مرکز صرف اپنے محبوب کی خوشنودی ہے۔

اے خوشا نصیب کہ وہ ساعت ارجمند اَب قریب آ گئی۔ عالم قدس کی طرف جانے والے مسافر تیار کھڑے ہیں، اپنے جلادوں کو حکم دے کہ دیر نہ کریں۔ تلواروں کی چھاؤں سے جنت کا فاصلہ بس ایک قدم کا ہے"۔

ایک قیدی کے اس جرأت آمیز بیان پر دربار میں سناٹا چھا گیا۔ عیسائی بادشاہ غصے سے دانت پیسنے لگا۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا:——

"ایک گستاخ و دریدہ دہن کی طرح زبان کھول کر تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے، تو لو تیار ہو جاؤ——شاہی دربار کی یہ توہین میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا——فولاد کی زنجیروں میں بھی حق پرستی کا غرور کم نہیں ہوا؟

تلواریں معزز سپاہیوں پر اٹھا کرتی ہیں، تم جیسے گستاخوں کی موت کا سامان تلوار نہیں آگ ہے"۔

غصہ میں کانپتے ہوئے اس نے جلادوں کو حکم دیا کہ——

"دہکتی ہوئی آگ پر تیل سے بھرا ہوا کڑاہ چڑھا دو۔ جب وہ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح کھولنے لگے تو مجھے فوراً خبر کرو"۔

بیڑیوں میں بندھے ہوئے قیدی سامنے کھڑے تھے۔ جلادوں کا دستہ حکم کی تعمیل کیلئے اُلٹے پاؤں رخصت ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نقیب نے آ کر خبر دی۔

"جہاں پناہ! دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ گستاخوں کے عبرتناک انجام کا تماشا دیکھنے کیلئے کرسیاں بچھا دی گئی ہیں"۔

یہ خبر سن کر عیسائی بادشاہ اپنے درباریوں کے ساتھ اٹھا۔ پیچھے پیچھے ننگی تلواروں کے سایے میں اسلام کے شہزادے بھی مقتل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آگ دہک رہی تھی، آنچ اور تیز کر دی گئی۔ قیامت خیز طغیانی کی طرح تیل کا چشمہ پھوٹ پھوٹ کر اُبلنے لگا۔

کمان کی طرح بنے ہوئے دو کھمبوں کے بیچ سے ایک موٹی سی رسی لٹک رہی تھی اس میں گردن کی گولائی کے برابر ایک حلقہ بنا ہوا تھا۔

سب سے پہلے جلادوں نے بڑے بھائی کی گردن میں رسّی کا حلقہ پہنایا اور جونہی اسے کھینچنا چاہا ——— دونوں بھائی چیخ اُٹھے: ———

"ہم یہ منظر نہیں دیکھ سکتے۔ پہلے ہمیں تیل میں ڈالا جائے"۔

بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا: ———

"صبر و ضبط سے کام لو۔ کھولتے ہوئے تیل کے قریب ہی چشمۂ کوثر کا دہانہ ہے۔ ایک ہی غوطہ وہاں تک پہنچنے کیلئے کافی ہے۔ میں لبِ کوثر تمہارا انتظار کروں گا۔ میرے پیچھے آؤ۔ خبردار گھبرانا مت۔ دہکتی ہوئی آگ کے پیچھے ہی جنت کی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ اچھا خدا حافظ"۔

جلاد نے رسّی کھینچی۔ دین کا ایک سرفروش مجاہد اُوپر اُٹھ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ شاید مقصود سے ہمکنار ہونے کی خوشی چہرے کا بوسہ لے رہی تھی۔ عالمِ قدس کا ایک نورانی دستہ رحمت کی طباق لئے ہوئے خیر مقدم کیلئے کھڑا تھا۔

کڑاہ کے مقابل پہنچ جانے کے بعد جلاد نے رسّی ڈھیلی کر دی۔ شاخِ طوبیٰ کا آشیاں نشیں اب نیچے اُتر رہا تھا۔ آتشِ سیال کی طرح کھولتے ہوئے تیل کا فاصلہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔ فضا میں کلمۂ شہادت کی آواز گونجی۔ آگ کی لہروں میں قدم رکھتے ہی "یا محمداہ" کا نعرۂ رسالت بلند ہوا۔ ایمان پر خاتمے کی علامت کی طرح یہ ایک وفادار مجاہد

اور ایک سچے مومن کا آخری نعرہ تھا —— چھوٹے بھائی اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا سکے۔ فرطِ الم سے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ بیخودی میں منہ سے ایک چیخ نکلی: —— ''بھائی! ساقیِ کوثر کے حضور ہمیں نہ بھولنا''۔ آنکھ کھلی تو منزلِ قدس کا مسافر عشق کے سمندر میں غوطہ لگا چکا تھا۔ فرشتے اس کی مقدس رُوح کو نُور کے جھرمٹ میں لئے عالم بالا کی طرف جا رہے تھے —— مرجھائے ہوئے پھول کی طرح جلی ہوئی لاش تیل کی سطح پر تیر رہی تھی —— لیکن رُوح شاداں و فرحاں ساقیِ کوثر کے حضور میں خلعتِ شاہانہ سے سرفراز ہو چکی تھی۔

اَب منجھلے بھائی کی باری تھی۔ رسّی کا پھندا گلے میں ڈالتے ہوئے جلاد نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا —— تنہائی، غریب الوطنی اور بیکسی سوکھے ہوئے چہرے سے پھوٹ پڑ رہی تھی۔ غم کی چوٹ سے پلکیں بھیگی ہوئی تھیں —— ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے منجھلے بھائی کو بھی الوداع کہا —— اسی طرح کا دردناک منظر اس بار بھی نگاہوں کے سامنے تھا۔ جب تک دیکھ سکا، دیکھتا رہا۔ نہ دیکھا جا سکا تو آنکھیں بند کرلیں —— پھر کلمۂ شہادت کی آواز گونجی، پھر ''یا محمداہ'' کا نعرہ بلند ہوا۔

اور چند ہی لمحوں کے بعد مدتوں کی تشنہ رُوح ساقیِ کوثر کے حضور جامِ رحمت سے سیراب ہو چکی تھی۔

پندرہ برس کا ایک نوجوان مجاہد، حُسن کا پیکرِ جمیل، روشن پیشانی، سرمگیں آنکھیں۔ دمکتا چہرہ۔ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔

یہ سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ نئی عمر میں دو بھائیوں کی تڑپتی لاشیں نظر سے گذری تھیں۔ دل غم سے نڈھال اور شکستہ حال ہو چکا تھا۔ لیکن ایمان کی غیرت اسی طرح تازہ دم تھی۔ اسلام کے جذبۂ وفا پر کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ جب اس عالم ہی سے منہ پھیر لیا تھا تو اَب زندگی کا ارمان کیسا؟ قاتل نے بڑھ کر گلے میں پھندا ڈال دیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ دل خیالِ جاناں میں ڈوب گیا۔ اُوپر اُٹھانے کیلئے رسّی کھینچنا ہی چاہتا تھا کہ مملکت کے وزیر نے ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت لجاجت کے ساتھ بادشاہ سے درخواست کی: ——

''جہاں پناہ! یہ کمسن نوجوان تنہا رہ گیا ہے۔ یہ چالاک نہیں معلوم ہوتا۔ نہایت بھولا بھالا ہے۔ آسانی کے ساتھ اسے مذہب اسلام سے منحرف کیا جا سکتا ہے۔ آپ اسے میرے حوالہ کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ چالیس دن کے اندر اسے عیسائی مذہب قبول کرنے کیلئے تیار کرلوں گا''۔

بادشاہ نے اپنے وزیر کی درخواست منظور کر لی۔ اشارہ کرتے ہی جلاد نے نوجوان کے گلے سے پھندا اُتار لیا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ منزل قدس کے مسافر کو آدھے راستے سے لوٹ آنا پڑا۔

مقتل سے اُٹھ کر وزیر نے اَپنے محل کا رُخ کیا۔ نوجواں بھی ہمراہ تھا اور زندگی سے گریزاں، کسی دوسری ارجمند موت کی راہ سوچ رہا تھا۔

وزیر نے محل میں داخل ہوتے ہی حرم سرا کو آواز دی ——— ''دیکھو! اس نوجوان کو سب سے زیادہ آراستہ اور مکلّف کمرے میں ٹھہراؤ۔ زندگی کی ساری آسائشیں اُس کے قریب جمع کر دو۔

تھوڑی دیر کے بعد کنیزوں کے جُھرمٹ میں شہزادی آداب بجالانے کیلئے باپ کے پاس حاضر ہوئی۔ وزیر نے بیٹی کو گلے سے لگالیا۔ سر پہ ہاتھ پھرا اور پہلو میں بٹھایا۔

''میری ذہین اور سعادت مند بیٹی! آج میں نے ایک نہایت سنگین اقدام کرلیا ہے تمہاری ذہانت سے توقع ہے کہ میری زبان کا بھرم ضائع نہیں ہوگا''۔

شہزادی نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا ——— ''بندگان عالی کا حکم سر آنکھوں پر کنیز جان دے کر بھی اپنا فرض پورا کرے گی، لیکن حکم کی صورت حال سے باخبر کیا جائے''۔

وزیر نے کہا ——— ''وہ تین جنگی قیدی جو عرب کی سرحد سے گرفتار ہوکر آئے تھے، وہ تینوں بھائی تھے۔ ان میں سے دو آج موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ سب سے چھوٹا بھائی جو ایک نہایت خوبصورت اور بڑا ہی شکیل و دلکش نوجوان ہے اُسے میں نے تختہ دار سے یہ کہہ کر اُتارلیا ہے کہ میں چالیس دن کے اندر اُسے اپنا مذہب تبدیل کرنے پر راضی کرلوں گا۔ بادشاہ نے میری درخواست کو شرف قبول عطا کیا ہے۔ میں اس نوجوان کو اپنے ہمراہ

لے کر آیا ہوں۔ اگر میں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا تو سارے روم میں میرے حسن تدبیر کا سکّہ بیٹھ جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بادشاہ متاثر ہو کر وزارت عظمٰی کا منصب میرے حوالہ کر دے"۔

شہزادی نے یقین کے انداز میں کہا —— "چالیس دنوں کی مدت بہت طویل ہے۔ اسے دامِ فریب میں لانا تو میرے لیے چند لمحوں کی بات ہے۔ تعجب ہے کہ ایک معمولی سی بات کیلئے آپ اس طرح فکر مند نظر آتے ہیں جس طرح کوئی ملک فتح کرنا ہے"۔

رات ڈھل چکی تھی۔ سارے محل پر نیند کی خموشی طاری تھی۔ روم کی سب سے حسین دو شیزہ، عشوہ طراز اداؤں کی مجسم ساحرہ، وزیر کی شہزادی اٹھی۔ غسل کیا، زرنگار جوڑے زیب تن کئے۔ بال سنوارے، نظر کی تیغ پر پانی چڑھایا اور سامان قتل سے پوری طرح آراستہ ہو کر اس کمرے کا رخ کیا، جہاں نوجوان قیام پذیر تھا۔ جونہی اندر داخل ہوئی، نوجوان زمین پر پیشانی رکھے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ زمین سے پیشانی لگی رہی، وہ روتا رہا۔ رات ڈھلتی رہی وہ روتا رہا۔

انتظار میں بیٹھے بیٹھے سحر ہو گئی۔ اپنے خرام ناز سے قیامت اُٹھانے والی شہزادی، سجدے سے ایک نوجوان کی پیشانی نہیں اُٹھا سکی۔ جلوۂ حُسن کا سارا غرور ٹوٹ کر رہ گیا ماتھے پر شکن ڈالے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں وہ پھر اپنی خواب گاہ کی طرف لوٹ گئی۔

دوسرے دن پھر قیامت کی ادائیں اپنے جلو میں لئے ہوئے شہزادی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا تھا، پلکیں آنسوؤں سے بوجھل تھیں۔ گردنیچی کئے ہاتھ باندھے وہ رات بھر کھڑا رہا، اسی حالت میں صبح ہو گئی۔ حُسن مغرور آج پھر خراب و خستہ حالت میں واپس لوٹا۔

تیسرے دن سرِ شام ہی اس نے نوجوان کے کمرے کا رُخ کیا۔ جونہی اندر داخل ہوئی خوشی میں مچل گئی۔ آج نوجوان نماز کی حالت میں نہیں تھا۔ تین دن کے بعد اب حُسن کو اپنا جادو جگانے کا موقعہ ملا تھا۔ ساحرانہ اداؤں کے ساتھ جونہی وہ آگے بڑھی، نوجوان نے کھڑے ہو کر نیت باندھ لی۔ آج بھی سارے ہتھیار دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اسی طرح ہفتوں گذر گئے۔ حُسن بے نقاب مچل مچل کر رہ گیا۔ لیکن نوجوان نے آنکھ

اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ چالیس دن کی مدّت قریب آ چکی تھی۔ وزیر نے ایک دن بیٹی سے دریافت کیا ——— "نوجوان کا کیا حال ہے؟ کافی دن گذر گئے ابھی تک تم نے کوئی خوشخبری نہیں سُنائی"۔

بیٹی نے شکست خوردگی کے انداز میں جواب دیا ——— "وہ تو ہر وقت اَپنے خدا کی عبادت ہی میں محو رہتا ہے۔ بات کرنا تو بڑی بات ہے اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی مجھے نہیں دیکھا۔ بادشاہ سے مزید چالیس دن کی مہلت اور حاصل کر لیجئے۔ آخر وہ فرشتہ نہیں ہے۔ ایک اِنسان اَپنی فطرت سے کب تک جنگ کرے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ ضرور شکار ہو کر رہے گا"۔

چالیس دن کی پہلی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ اَب دوسری میعاد چل رہی تھی۔ ہر آنے والی رات کو نوجوان کی بے نیاز محویت کا وہی عالم تھا۔ حقیقت کے سامنے بناوٹ کی بساط ہی کیا ہے۔ آخر ایک دن فریب کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک خدا ترس زاہد و عابد نوجوان کی زندگی شہزادی کے دل پر اثر انداز ہو کے رہی۔

ہر روز کی طرح رات کی بھرپور تنہائی میں آج بھی شہزادی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن دل کا عالم بدل چکا تھا۔ شوق میں ڈوبی ہوئی یہ پہلی آواز تھی جو شہزادی کے مُنہ سے نکلی: ———

"پاک دامن نوجوان! میں اس مذہب پر لعنت بھیجتی ہوں جو اَپنی بیٹیوں کی عصمت دے کر، دلوں میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لیتا ہے دل کے گہرے اخلاص کے ساتھ آج میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ مجھے اسلام کے اس پاک دین میں داخل کر لے جس نے تجھے فرشتوں کا تقدس عطا کیا ہے۔ جو دنیا میں صرف اَپنی صداقت اور روحانیت کی کشش سے پھیلا ہے۔ عورت اور مال و زر کی رشوت دے کر پھیلنے والا مذہب دنیائے انسانیت کی سب سے بڑی لعنت ہے"۔

نوجوان نے نیچی نظر کئے ہوئے کلمۂ شہادت کی تلقین کی۔ توحید و رسالت کا اقرار کیا اور حلقۂ اسلام میں داخل کر لیا۔

مسلمان ہو چکنے کے بعد شہزادی نے مشورہ دیا کہ ہمیں جلد سے جلد یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ ابھی ہمیں دینِ حق کی تبلیغ کیلئے زندہ رہنا ہے۔ عرب کی سرحد یہاں سے قریب

ہے۔ وہیں نکل چلیں، ورنہ میرا اسلام ظاہر ہو جانے کے بعد ہم دونوں کی جان کو ہلاک کیے بغیر یہ ظالم دم نہیں لیں گے۔

نوجوان نے اس شرط پر چلنا منظور کر لیا کہ تمہیں اپنے پورے جسم کے ساتھ نقاب کے اندر رہنا ہوگا۔ اور میرے آگے نہیں پیچھے چلنا ہوگا۔

دوسرے دن، جبکہ رات ڈھل چکی تھی۔ سارا محل نیند کی آغوش میں تھا۔ دو تیز رفتار گھوڑے محل کے عقبی دروازے پر کھڑے تھے۔ تاریکی میں دو سائے بڑھتے ہوئے نظر آئے چند ہی لمحوں کے بعد ہلکی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ آبادی سے باہر نکل کر یہ آواز اور تیز ہو گئی۔ ہوا سے باتیں کرتے ہوئے گھوڑے سرپٹ دوڑتے جا رہے تھے۔ آگے آگے نوجوان اور پیچھے چند قدم کے فاصلے پر شہزادی چل رہی تھی۔ ابھی رات بہت باقی تھی۔ شہر سے کافی دور نکل آنے کے بعد گھوڑوں کی رفتار دھیمی کر دی گئی۔ اب آہستہ آہستہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ راستے سے یہ سوار گذر رہے تھے۔ جونہی دہانے کے قریب پہنچے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کان میں آئی۔ دونوں چوکنے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تلواریں نیام سے باہر کر لی گئیں۔ شہزادی نے کہا —— "معلوم ہوتا ہے دشمن ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں"۔

نوجوان نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ——

"کچھ گھبرانے کی بات نہیں۔ آنے والے اگر بُری نیت سے آ رہے ہیں تو ہماری تلوار ان کی راہ میں حائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ اور اگر وہ صرف راہگیر ہیں تو ہم ان سے کوئی تعرض نہیں کریں گے"۔

دو پہاڑوں کے دہانے سے باہر نکلنے کے بعد نوجوان ایک عجیب وغریب تماشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بیساختگی میں منہ سے چیخ نکل گئی: ——

"بھائی جان! کئی مہینے گذر گئے آپ حضرات کو جام شہادت نوش کیے، آپ یہاں کیسے؟ عالم برزخ میں رہنے والے کیا زندوں کی طرح دنیا میں آ سکتے ہیں؟"

بڑے بھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: —— "شہیدوں کا حال عام مُردوں

سے بالکل مختلف ہے۔وہ جہاں جس برزخ میں جانا چاہیں جاسکتے ہیں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مرحوم بھائی نے یہ خوشخبری سُنائی کہ ملاءِ اعلیٰ میں تمہاری طہارت و پاکدامنی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہارا عقد ہم نومسلمہ شہزادی سے کر دیں۔شہیدوں کی یہ پاک ولطیف روحیں تمہاری بزمِ نکاح میں شرکت کیلئے حاضر ہوئی ہیں"۔

شہزادی وہیں کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی۔ عالمِ غیب سے آنے والوں کا یہ قافلہ دیکھ کراُ سے اسلام کے کائنات گیر اقتدار کا یقین اور بڑھ گیا —— جلدی جلدی بزمِ نکاح منعقد ہوئی۔ارواحِ طیبات کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی رسم ادا کی گئی۔خطبۂ نکاح کے بعد تمام رُوحوں نے نئے جوڑے کو مبارکباد کی دعائیں دیں۔ بھائیوں نے دُولہا اور دُلہن پر جنّت کے پھول نچھاور کیے۔

روحانیوں کا یہ سارا مجمع دم کے دم میں نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

اَب محرم آنکھوں پر شہزادی نے چاندنی رات میں اپنے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا۔پہلی بار نوجوان کی نظر پڑی تو ایسا محسوس ہوا کہ جنّت سے حُسن ولطافت کی کوئی حور اُتر آئی ہے۔

"دل دیوانہ" دو حیرتوں کے نشانے سے ابھی ہٹا نہیں تھا کہ فضاؤں میں یہ آواز گونجی جنت کی براتی جنت کا دولہا، جنت کی حُور مبارک ہو!

ارشد القادری

حضرت ابراہیم ادہم رضی اللہ عنہ کی عظیم الشان کرامت

بلخ کی شہزادی

شاداب وادی، حسین کہسار اور دل کشا مناظر کیلئے بلخ کا سارا شہر سارے جہان میں عروس البلاد کے نام سے مشہور تھا۔ موسمِ گرما میں دُور دراز خطوں سے سیاحوں کے قافلے رواں دواں چلے آتے تھے اور اچانک شہر کی رونق میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہی جشن بہاراں کے دن تھے کہ خراسان کی طرف سے سیاحوں کا ایک کارواں اترا۔ اس قافلے میں ایک حسین و خوبرو نوجوان بھی تھا۔ گردشِ ایام کا ستایا ہوا چہرہ ہزاروں دل کشی کے باوجود نہیں چھپتا تھا۔ شکستہ پیراہن، بکھرے ہوئے بال، اداس آنکھیں، اور پژمردہ صورت سے صاف آشکارا تھا کہ وہ اپنے وقت کا آشفتہ حال مسکین ہے۔

بہار کا موسم گزر جانے کے بعد سیاحوں کے تمام قافلے اپنے اپنے مسکن کی طرف واپس لوٹ گئے۔ لیکن نوجوان، بلخ کی خوشگوار شام و سحر سے کچھ مانوس ہوا کہ یہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ شاہی باغ کے قریب جھاڑیوں کے کنج میں اس نے ایک کٹیا بنالی اور وہیں رہنے سہنے لگا۔ دن بھر وہ شہر کا گشت کرتا اور شام سے پہلے اپنی کٹیا میں لوٹ آتا۔ ایک مدت سے اس کی زندگی کا یہی معمول تھا۔ باغ کے شاہی ملازمین بھی ایک فقیر سمجھ کر کبھی اس سے مزاحم نہیں ہوتے تھے۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں کہسار کی چوٹیوں پر جھلملا رہی تھیں۔ فقیر شہر کے گشت سے لوٹ چکا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اس کا دل بے حد اداس تھا۔ طبیعت بہلانے کے خیال سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا باغ میں پہنچ گیا۔ کچھ ہی دُور چلا تھا کہ

ایک آواز کان میں آئی۔ کون اجنبی چلا آ رہا ہے؟ واپس لوٹ جاؤ! کیا تمہیں خبر نہیں کہ آج سُلطانِ بلخ کی شہزادی گل گشت کیلئے یہاں تشریف لائی ہیں۔

جونہی آواز کی طرف رُخ پھیر کر دیکھا ——— کہ ایک ہی جلوۂ محشر طراز نے دل کا کام تمام کر دیا۔ ایک شیشہ ٹوٹا، ایک بجلی چمکی اور ایک بے نوا فقیر کا خرمنِ ہستی آن واحد میں جل کر راکھ ہو گیا۔ شہزادی کنیزوں کے جھرمٹ میں آگے بڑھی ——— تلواروں کی کاٹ فولادی ڈھالوں پر روکی جا سکتی ہے ——— لیکن چشمِ سحر طراز کا ایک ہی تیر نیم کش پوری ہستی کو گھائل کر دینے کیلئے کافی ہے۔

نظر کی چوٹ سے فقیر بری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے دل تھامے ہوئے اٹھا اور اپنی کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا۔

دل کا شکیب تو رخصت ہو ہی چکا تھا۔ آنکھوں کی نیند بھی اڑ گئی۔ غم کی تپش میں ساری رات کٹی۔ آہستہ آہستہ عشق کی چنگاری دل کے قریب سلگتی رہی۔ شوق کا اضطراب بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک گھائل پنچھی کی طرح فقیر کی زندگی ایک دردناک آزار کا شکار ہو گئی۔ کبھی مکمل سکوت، کبھی بادِ صبا سے ہمکلامی۔ کبھی مناجاتِ سحر گاہی، ویرانے سے اُنس، تنہائی سے پیار، یک بیک زندگی کا عجیب حال ہو کے رہ گیا۔

اِسی عالمِ کرب میں کئی مہینے بیت گئے۔ رفتہ رفتہ جوشِ جنوں کا چڑھتا ہوا طوفان تھمنے لگا۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد دل کی تپش ایک مخصوص حالت پر آ کر رک گئی۔

اَب فقیر پر مدہوشی کا وہ عالم نہیں تھا۔ اَب ایک حوصلہ مند مسافر کی طرح عشق نے ہاتھوں میں چراغ دے دیا تھا۔ اور آرزو کے شوق نے منزل کی طرف بڑھنے کی ہمت پیدا کر دی تھی۔

حسبِ معمول سلطان بلخ کا دربار لگا ہوا تھا۔ فریادیوں کے مقدمات کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ اتنے میں ایک نقیب نے آ کر اطلاع دی۔ "جہاں پناہ ایک فقیر قلعۂ معلیٰ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ پائے گاہ سلطانی پر باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ غالباً وہ کوئی فریاد لے کر حاضر ہوا ہے؟"

حکم صادر ہوا کہ اسے باریاب کیا جائے۔ چند ہی لمحے کے بعد فقیر دربار میں حاضر کیا

گیا۔ پیش ہونے والے مقدمات کی سماعت کا سلسلہ ختم ہو چکنے کے بعد خطاب شاہی فقیر کی طرف متوجہ ہوا ـــــــ

''تمہاری کیا فریاد ہے؟''

فقیر نے جواب دیا: ـــــــ

''ایک ایسی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں جسے مجمع عام میں نہیں پیش کر سکتا۔ تنہائی کا موقع عنایت فرمایا جائے''۔

دربار ختم ہونے کے بعد فقیر طلب کیا گیا۔ وزیر نے دریافت کیا ـــــــ ''جہاں پناہ کے حضور میں تمہیں کیا کہنا ہے؟''

''جہاں پناہ کی شہزادی کے ساتھ نکاح کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں''۔ فقیر نے نہایت جرأت سے جواب دیا ـــــــ

ابھی فقیر کی زبان کا یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ فرطِ غضب میں وزیر کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ بھرپور برہمی کے انداز میں کانپتے ہوئے کہا:

''حرم شاہی کے ساتھ ایک فقیر کی نہایت توہین آمیز جسارت ہے یہ لب کشائی کی جرأت۔ پہلے تمہیں اپنی حیثیت کا اندازہ لگانا چاہئے تھا۔ اس ناقابل برداشت گستاخی کی تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ تاکہ آئندہ خاندانِ شاہی کی حرمتوں سے کھیلنے کی کسی کو جرأت نہ ہو''۔

سُلطان نے وزیر کو خاموش کرتے ہوئے کہا: ـــــــ

''یہ جرم نہیں ہے۔ اسلام کا بخشا ہوا حق استعمال کر رہا ہے۔ پیغامِ نکاح کیلئے اسلام میں شاہ و گدا، امیر و غریب اور چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اس کی درخواہت کا جواب تازیانوں کی دھمکی سے نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنا جواب حاصل کرنے کیلئے ایک ہفتے بعد آئے''۔

یہ جواب سن کر پیشانی میں امید کی تابانی لئے ہوئے فقیر دربار شاہی سے واپس لوٹا۔ دلِ مبتلا کیلئے ایک ہفتہ کی مدّت صبح قیامت کی طرح طویل ہوگئی۔ بڑی مشکل سے انتظار کے یہ دن کٹے۔

اس درمیان میں بادشاہ نے وزیر کو اپنی منشا سے آگاہ کر دیا تھا کہ صاف انکار کے بجائے حسنِ تدبیر سے فقیر کو ٹالا جائے۔ یا پھر کوئی ایسی کڑی شرط رکھ دی جائے جس کا پورا کرنا قریب ناممکن ہو۔

جب ساتویں دن فقیر دربار میں حاضر ہوا تو وزیر نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور مہرو شرافت کی زبان میں فقیر سے مخاطب ہوا: ——

''شہزادی کیلئے دنیا کے نامور اور عظیم المرتبت بادشاہوں کی طرف سے بے شمار پیغامات موصول ہوئے ہیں۔ تمہارا پیغام بھی انہیں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ البتہ تم اگر ایک شرط پوری کر دو تو میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا پیغام قبول کر لیا جائے گا''۔

وزیر کا جواب سُن کر اندھیرے میں امید کی ایک کرن پھوٹی۔ اور فرطِ شوق میں فقیر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بے خودی کی حالت میں بول پڑا: ——

''فرمایا جائے میرے لائق کیا خدمت ہے۔ میں شرط پوری کرنے کیلئے متاعِ زندگی تک داؤ پر لگا دوں گا —— !''

وزیر نے کہا: ——

''شہزادی کی انگوٹھی کیلئے سیاہ رنگ کا ہیرا چاہئے۔ اس سے زیادہ اور کوئی شرط نہیں''۔

فقیر نے جواب دیا: ——

''اس شرط کی تکمیل اگرچہ ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اسے پورا کر دوں گا —— سُنا ہے کہ وہ ہیرا سیاہ رنگ کے پہاڑوں کی برفیلی چوٹی میں پیدا ہوتا ہے —— خدا میری مدد کرے گا —— !''

رات بھیگ چکی تھی۔ سارا شہر سناٹے کے عالم میں محوِ خواب تھا۔ فقیر کی کٹیا سے کبھی کبھی سسکیوں کی آواز سنائی پڑتی تھی، پیشانی زمین پر رکھے اشک بار آنکھوں کے ساتھ وہ کہہ رہا تھا:

''اے دردمندوں کے چارہ ساز! سلگتا ہوا دل لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ حسرتوں کی جلی ہوئی راکھ کو زندہ کر دے۔ اے مجبور بندوں کی آخری امید گاہ!

مشکلات کے اندھیرے میں قدم اُٹھا رہا ہوں اپنی رحمتوں کے سہارے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اپنے حبیب کی شاداب تجلیوں کے صدقے میں میرے رستے ہوئے زخموں اور بھیگی ہوئی پلکوں پر رحم فرما''۔

صبح ہوتے ہوتے اس کے آنسوؤں کا طوفان تھم گیا۔ سجدے سے سر اٹھایا تو پیشانی کے اُفق پر یقین کا اُجالا چمک رہا تھا۔ شاید رحمتِ بندہ نواز کی کوئی غیر محسوس تجلّی دل کے ویرانے میں اُتر آئی تھی۔ ایک اٹوٹ عزم کا تیور لئے ہوئے فقیر اُٹھا۔ اور کاندھے پر تیشہ رکھ کر آبادیوں سے باہر نکل آیا۔ عالمِ وحشت میں شبانہ روز چلتا رہا۔ اسے اپنی منزل خود نہیں معلوم تھی۔ کہ دل کے غیبی سگنل پر قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ خدا کی اس وسیع کائنات سے صرف سیاہ رنگ کے ہیرے کا ایک چمکتا ہوا نگینہ مطلوب تھا۔

چلتے چلتے ایک دن کہسار کی وادیوں میں شام ہوگئی۔ ہر طرف وحشت ناک تاریکی اور بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی سربفلک پہاڑوں کی دیواریں راستہ روکے کھڑی تھیں۔ حیرانی کے عالم میں ایک پتھریلی چٹان پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خوفناک درندوں کی آوازیں ہر طرف سے گونجنے لگیں۔ زندگی خطروں میں گھر گئی جان کے لالے پڑ گئے لیکن خدا کی کارسازی پر اس کے دل کا مخفی اعتماد پہاڑ کی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ کرشمۂ غیب کے ایک تماشائی کی طرح وہ ساری رات جاگتا رہا۔ صبح کے وقت جونہی آنکھ لگی کسی نے شانہ پکڑ کر ہلایا۔ آنکھ کھل گئی —— ایک بوڑھا آدمی سامنے کھڑا کہہ رہا تھا:

''جس راستے سے تم یہاں تک پہنچے ہو اس کے دہانے پر کالے پہاڑ کی برفیلی چوٹی سے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کر گری ہے۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے تیشہ اٹھاؤ اور کاٹ کر اپنے نکلنے کا راستہ بنالو ورنہ آج شام تک یہ ساری وادی برف کے سیلاب سے ڈوب جائے گی''۔

فقیر گھبرا کے اٹھا جیسے ہی وادی کے دہانے پر پہنچا دیکھا کہ برف کی بہت بڑی چٹان راستے میں حائل ہوگئی ہے۔

سارا دن تیشہ چلاتا رہا۔ دن بھر کی لگاتار محنت کے باوجود گزرنے کے لائق راستہ نہیں بن سکا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ فقیر نے پوری طاقت کے ساتھ تیشہ چلایا۔ بھرپور وار سے

چٹان کا بہت بڑا حصہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ جمی ہوئی چٹان کے اندر سیاہ رنگ کا ایک تابدار نگینہ چمک رہا تھا۔ فقیر نے حیرت کے ساتھ اسے کھود کر نکالا۔ ہتھیلی پر رکھتے ہی ایک کرن چھوٹی اور آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

پردۂ غیب کی کارسازی پر فقیر کا دل جھوم اٹھا۔ نامعلوم طور پر اسے یقین ہو گیا کہ یہی وہ سیاہ رنگ کا ہیرا ہے جسے گوہرِ مقصود کیلئے شرط قرار دیا گیا ہے۔

ایک حیرت انگیز خوشی کے عالم میں وہ بلخ کی طرف جست لگاتا ہوا چل پڑا۔ کئی دن کے شبانہ روز سفر کے بعد شام کو وہ بلخ پہنچ گیا۔ دوسرے روز شاہی دربار میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا۔

وزیر نے دیکھتے ہی ایک برہمی کے انداز میں کہا:——

''تم پھر آ گئے۔ حالانکہ اس دن تم سے آخری بات کہہ دی گئی تھی۔ شریف لوگوں کا یہ شیوہ نہیں تھا''۔

فقیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:——

''برہم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شرط پوری کرنے آیا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے سیاہ رنگ کا چمکدار ہیرا بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بار دنیا کا ایک بے مثل ہیرا دیکھ کر سارے درباری دنگ رہ گئے۔ بادشاہ بھی مجسم تصویرِ حیرت بنا دیکھتا رہا۔

وعدہ کے مطابق فقیر نے اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ اُسے کامل یقین تھا کہ شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہونے کی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ لیکن وائے رے ناکامی قسمت! کہ پھر وزیر نے ایک پانسہ پھینکا اور آخری فیصلہ سنانے کیلئے دوسرے دن دربار میں طلب کیا گیا۔ ارمان اور آرزو کی ایک دنیا ہمراہ لئے ہوئے فقیر دوسرے دن دربار میں حاضر ہوا۔ عالمِ شوق میں سراپا انتظار ہی تھا کہ وزیر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا:——

''اِس میں شک نہیں کہ تم نے طلبِ صادق کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن ایک آخری شرط اور رہ گئی ہے اسے بھی پوری کر دو تو تمہاری درخواست قطعاً منظور کر لی جائے گی۔ یقین کرو! تمہارے جذبۂ صادق کی یہ آخری آزمائش ہے، بالکل آخری''۔

توقع کے خلاف وزیر کا یہ جواب سُن کر فقیر کے تصورات کی دنیا بکھر گئی۔ یکا یک دل کی ساری امنگوں کا خون ہو گیا۔ لیکن وہ عشق ہی کیا جس میں پیہم ناکامیوں کی چوٹ نہ کھانی پڑے۔ ہمت ہارنا راہِ الفت کے مسافر کا شیوہ نہیں ہے۔

پھر اُس نے ٹوٹی ہوئی امیدوں کو سمیٹا اور وزیر سے دریافت کیا:——

''اچھا اَب وہ آخری شرط کیا ہے؟''

وزیر نے جواب دیا:——

''شہزادی کے کان کے آویزوں کیلئے دو بڑے بڑے سفید موتی مطلوب ہیں جو رنگت و تابش میں ساری دنیا کیلئے بے مثال ہوں''۔

فقیر آج دوسری مرتبہ گھائل ضرور ہوا تھا لیکن اس کے باوجود مایوس نہ تھا۔ پھر آج کی رات پیشانیوں کی خلش اور مناجات کی گریہ وزاری میں کٹی۔ صبح ہوئی تو خدا کا نام لے کر اٹھا اور جنونِ عشق کی آخری مہم پر روانہ ہو گیا۔ لگاتار کئی دن چلنے کے بعد ایک سمندر کے کنارے پہنچ کر دم لیا۔ عشق کی فلک پیما ہمت بھی کیا قیامت ہوتی ہے۔ اپنے تئیں آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ سمندر کو خشک کر کے تہہ میں چمکنے والے موتیوں کا سراغ لگا لے گا۔ اس یقین کے جذبہ میں دونوں ہاتھوں سے اس نے سمندر کا پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ اسی عالمِ جنوں خیز میں کئی دن گذر گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو پہاڑوں کی طرح سر اٹھاتی ہوئی موجوں کا وہی عالمِ شباب تھا۔ لیکن قربان جایئے عقیدہ عشق کی حیرت گری کے کہ اتنی کھلی ہوئی ناکامی کے باوجود سمندر پر فتح پانے کا عزم ذرّہ برابر متزلزل نہیں ہوا تھا۔

کئی دِن کی مسلسل محنت سے اس کے بازو شل ہو چکے تھے۔ سمندر کے بجائے جگر کا خون جلتے جلتے خشک ہو چلا تھا۔ اتنے عرصہ کے بعد آج پہلی بار اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ نہ جانے چشمِ امید کی وہ کون سی ادا تھی کہ اچانک غیرتِ کرم کا سمندر اُبل پڑا۔ نظر جھکی تو موجوں کا ایک ریلا جگمگاتے ہوئے موتیوں کا ڈھیر کنارے ڈال کر واپس جا رہا تھا۔ فرطِ مسرت میں فقیر کی روشن پیشانی سجدہ شکر کے اضطراب میں بوجھل ہو گئی۔ آج اپنی کامیابی سے زیادہ شانِ رحمت کی چارہ گری پر وہ نازاں تھا۔ اب مجاز سے

حقیقت کی طرف بڑھنے کا اسے سراغ مل چکا تھا۔

سجدۂ شکر کی لذّتوں سے شادکام ہونے کے بعد موتیوں کا ڈھیر دامن میں اٹھا کر رکھ لیا۔ اور فتح مندی کے سرور میں جھومتا ہوا بلخ کی طرف چل پڑا۔ وہ قدموں کے بل پر نہیں دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے دوش پر چل رہا تھا۔

بلخ میں پہنچ کر سیدھا شاہی محل میں داخل ہوا۔ بھرے دربار میں بادشاہ کے پایۂ تخت کے سامنے دامن کے سارے موتی بکھیر دیئے۔ تڑپتی ہوئی کرنوں کی جگمگاہٹ سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکاچوند ہوگئی۔ حیرت سے سارے درباریوں پر سکتے کا عالم طاری تھا۔

اَب وہ ساری شرطیں پوری کر چکا تھا۔ اور نہایت بے تابی کے ساتھ مژدہ جانفزا کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ وزیر نے پھر اس کے جذبۂ شوق کے ساتھ مذاق کیا۔ پھر اس کی شاداب امیدوں کا خون بہایا۔

''تم نے ساری شرطیں پوری کر دیں —— لیکن ذرا غور کرو کہ ایک گمنام فقیر اور ایک معزز شہزادی کے درمیان منصب وحیثیت کا جو فرق ہے اسے کیونکر مٹایا جا سکتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنے جنوں خیز مطالبہ سے دستبردار ہو جاؤ۔ شاہی خاندان کے اعزاز کو صدمہ پہنچا کر تم کبھی سرخرو نہیں ہو سکو گے''۔

وزیر کا یہ جواب ایک تیز نشتر کی طرح فقیر کے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ دل کا وہ آبگینہ جو مایوسیوں کی زد سے بچا بچا کے رکھا تھا اچانک چھن سے ٹوٹ گیا۔ پہاڑوں اور سمندروں کا فاتح آج کامیابی کی منزل کے قریب پہنچ کر شکست کھا چکا تھا۔ کہ یک بیک شاہی محل میں شور برپا ہوا۔ بدحواسی کے عالم میں بال نوچتی ہوئی ایک کنیز نے آ کر خبر دی کہ اچانک شہزادی بیہوش ہو چکی ہیں۔ نبض ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

سارے محل میں کہرام مچا ہوا ہے، بادشاہ کے پہنچتے پہنچتے شہزادی کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔

اس حادثہ پر ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی۔ سارا دربار سوگ میں ڈوب گیا۔ شدتِ غم سے بادشاہ پاگل ہو گیا۔ اس خبر سے سارے شہر میں ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ فقیر کے

پہلو میں حسرتوں کی ایک لاش تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب امیدوں کی آخری لاش بھی اسے اٹھانا پڑی۔

اس قیامت خیز واقعہ پر مملکت کا ہر شخص سوگوار و آبدیدہ تھا۔ لیکن حیرت تھی کہ فقیر کے چہرے سے اضطراب و غم کی کوئی علامت نہیں ظاہر ہو رہی تھی۔

جب تک شہزادی کی تجہیز و تکفین کا سامان ہوتا رہا فقیر سر جھکائے ساکت و خاموش بیٹھا رہا۔ جب جنازہ شاہی محل سے روانہ ہوا تو ہمراہ چلنے والوں میں یہ بھی شامل ہو گیا۔ شہر کے سب سے وسیع میدان میں لاکھوں کے ہجوم میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور شام ہوتے ہوئے شاہی قبرستان میں شہزادی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

افسوس کہ ناز و ادا اور جمال و زیبائی کا ایک گُلِ رعنا آج کئی من مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ یہ تنہا ایک شہزادی کی موت نہیں تھی۔ ساتھ ساتھ بے شمار امیدوں کی بھی موت ہو گئی۔

رات کی زلفِ سیاہ کمرے سے نیچے ڈھلک چکی تھی۔ سارا شہر سوگوار اداسیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تنہا ایک فقیر اپنی کٹیا میں جاگ رہا تھا۔ یک بیک سناٹے کی بھرپور خاموشی میں تیسہ لئے ہوئے اٹھا اور سیدھا شاہی محل کے قبرستان میں داخل ہو گیا۔

آج عشق نے اسے بے انتہا حوصلہ مند بنا دیا تھا۔

آستین چڑھائے ہوئے آج وہ موت سے لڑنے آیا تھا۔ اپنے جنوں پرور یقین کے سہارے آج اسے تقدیر کا فیصلہ بدلوانا تھا۔ سب سے پہلے گھٹنا ٹیک کر اس نے شہزادی کے مدفن کی خاک کو بوسہ لیا۔ اس کے بعد جلد جلد قبر کی مٹی ہٹائی چونکہ قبر بالکل تازہ تھی اس لئے جلدی تختے تک پہنچ گیا۔ چند تختے اٹھانے کے بعد جونہی کفن کا آنچل نظر آیا اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ بے اختیار قبر کے اندر اُتر پڑا اور عشق کی بخشی ہوئی ہمتوں کے سہارے نعش کو باہر نکالا۔ کاندھے پر رکھا اور تیز تیز ویران جھاڑیوں سے گزرتا ہوا کٹیا میں پہنچ کر دم لیا اور کاندھے سے نعش اتار کر نہایت حفاظت و احترام کے ساتھ ایک گوشے میں لٹا دیا۔

اب عشق کا فرشتہ ایک ٹھنڈی لاش کے اندر زندگی کی تپش واپس لانے کیلئے آسمان کی طرف مائلِ پرواز تھا۔

آنسوؤں میں نہائی ہوئی دعا جونہی عشق سے ٹکرائی اچانک کٹیا کے دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آنے والا اپنی وضع قطع سے کوئی طبیبِ حاذق معلوم ہو رہا تھا۔ سر پر دواؤں کا بوجھ لادے ہوئے اس کے ہمراہ ایک ملازم بھی تھا۔ کٹیا کے اندر داخل ہوتے ہی طبیب نے شہزادی کا کفن اٹھایا۔ نبض پر ہاتھ رکھا اور فقیر کو آواز دی:

''وقت کی قیمتی مہلت ضائع نہ کرو زندگی کی واپسی کی توقع گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہے۔ شہزادی کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ سکتے کی حالت طاری ہے''۔ زنبیل سے دوا کی ایک شیشی نکال کر فقیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:——

''نہایت تیزی کے ساتھ شہزادی کے تلوؤں پر اس کی مالش کرو''۔

اَب فقیر کی پُر امید نگاہوں کا عالم قابل دید تھا۔ ادھر اس نے دواؤں کی مالش شروع کی اُدھر طبیب کی نگاہیں شہزادی کے چہرہ پر جم گئیں۔

چند لمحے کے بعد اچانک شہزادی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی ——فقیر یہ کرشمۂ حیرت دیکھ کر خوشی میں پاگل ہو گیا۔

طبیب نے پھر ایک سیّال دوا کی شیشی اٹھائی اور شہزادی کی ناک میں اس کے چند قطرے ٹپکائے۔ فوراً ہی ایک چھینک آئی اور شہزادی نے آنکھیں کھول دیں۔

اچانک ایک اجنبی ماحول میں اپنے آپ کو دیکھ کر شہزادی حیران رہ گئی۔ کفن کے آنچل سے منہ ڈھانپتے ہوئے کہا:——

''میں اس وقت کہاں ہوں؟ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے، جلد بتاؤ —— دماغ پاگل ہو رہا ہے——!''

فقیر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا:——

''''کسی بات کا اندیشہ نہ فرمایئے۔ آپ اس وقت ایک محفوظ پناہ گاہ میں ہیں'' اور اس کے بعد تفصیل وار شروع سے آخر تک سارا واقعہ بیان کیا۔ وہ بیان کرتا رہا۔ اور شہزادی عالَمِ حیرت میں ڈوبی ہوئی سنتی رہی۔ سارا ماجرا سن لینے کے بعد شہزادی کو عشقِ صادق کی حمایت میں قدرت کی کارفرمائی کا یقین آ گیا۔ لجاتی ہوئی آواز میں بمشکل تمام یہ الفاظ منہ

سے نکل سکے:

"پردۂ غیب کی چارہ گری جس خواب کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اب اسے شرمندۂ تعبیر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا"۔

طبیب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:——

"تو پھر دیر کیا ہے——؟ میرے خیال میں ایک لمحہ کیلئے بھی ماحول کا غیر محرم رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا——!"

یہ کہتے ہوئے طبیب نے فقیر کو سامنے بٹھایا اور اپنے ساتھی ملازم کو شاہد بنا کر ایجاب و قبول کی رسم ادا کر دی اور ایک فرشتۂ غیب کی طرح دُعا مانگتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ آج فقیر کی فاتحانہ مسرتوں کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ خوشی کے آنسوؤں سے آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور بار بار زبان پر یہ الفاظ مچل رہے تھے:——

"خداوندا تیری شان بندہ نوازی کے قربان یہیں میں شفایاب بھی ہو گیا سچ فرمایا تیرے رسولِ محترم نے کہ تیرے کرم پر بھروسہ کرنے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے"۔

فقیر کی زندگی کا آج نیا دور شروع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ خوشحالی کے دن سنورنے لگے۔ مستقبل کا چہرہ نکھرنے لگا۔ وہ شریکِ غم ساتھی کی طرح شہزادی نے فقیر کے ساتھ اپنی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شاہی زندگی غربت و افلاس کے سانچے میں ڈھل گئی۔ کسی حال میں بھی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ کئی سال گذر گئے مسکین شہزادی نے اپنے دوبارہ جی اٹھنے کے راز سے کسی کو بھی باخبر نہ ہونے دیا۔ فقیر کی کٹیا سے شاہی محل کا فاصلہ کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ صرف فقیر کیلئے زندہ کی گئی ہے۔ اس لئے زندگی کا دائرہ عام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خاندان کی لاڈلی شہزادی کے انتقال کے بعد شاہی محل پر ہمیشہ کیلئے سوگ ہو گیا دربار کی ساری رونقیں سرد پڑ گئیں بیٹی کے غم میں بادشاہ کی زندگی مرجھائے پھول کی طرح اداس

ہوگئی۔ اَب وہ چہل پہل تھی نہ وہ شاہانہ کروفر کا اہتمام تھا۔ طبیعت سادگی کی طرف مائل ہو گئی۔ دینی مشاغل سے دلچسپیاں بڑھنے لگیں۔ مسجدوں کی تعمیر اور مدرسوں کا قیام، وعظ و تذکیر کی مجالس کا انعقاد، بادشاہ کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ ہفتہ کا ایک دن تعلیمی اور فلاحی اداروں کا معائنہ کرنے کیلئے مخصوص تھا۔

آج ایک مکتب کی سالانہ تقریب تھی۔ تمام بچے صاف ستھرے لباس میں بادشاہ کے خیر مقدم کیلئے کھڑے تھے۔ جونہی بادشاہ کی سواری آئی تمام بچوں نے جھک کر سلام کیا۔ ناگہاں بادشاہ کی نظر ایک چار سالہ بچے پر پڑی اور دل از خود اس کی طرف کھنچنے لگا۔ بار بار اسے دیکھنے کی خواہش مچلنے لگی۔ بالآخر اسے اپنے پاس بلا کر بٹھالیا اور معلم سے دریافت کیا:

''اتنا روشن و دلکش چہرہ ریاست میں پہلی بار نظر سے گزرا ہے۔ یہ کسی ارجمند باپ کے چمن کا پھول ہے''۔

معلّم نے جواب دیا:——

''مدرسہ میں داخل ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ اسے لے کر کبھی کبھی اس کا باپ بھی اس کے ہمراہ آتا ہے۔ ویسے ظاہری وضع قطع سے غریب و مسکین آدمی معلوم ہوتا ہے''۔

بادشاہ حیران تھا کہ ایسا ہونہار تابندہ بچہ کیونکر پیدا ہو گیا۔ چلتے وقت معلّم کو ہدایت کر گیا کہ اس کے باپ کو بچے کے ہمراہ دربار میں حاضر کیا جائے۔ شام کو معلّم نے بادشاہ کا حکم فقیر کو پہنچاتے ہوئے تاکید کی کہ وہ اپنے بچے کو لے کر دربار میں فوراً حاضر ہو جائے۔

فقیر نے جب شہزادی سے اس کا تذکرہ کیا تو یکایک اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ رہ رہ کر اسے محسوس ہونے لگا کہ شاید مشیتِ الٰہی ایک سربستہ راز کو بے نقاب کر دینا چاہتی ہے۔

حاکم کا حکم تھا مجبوراً دوسرے دن بچے کو بنا سنوار کر باپ کے ہمراہ کر دیا۔ پیدائشی حسن کی رونق کیا کم تھی کہ اب ظاہری آرائش نے اسے نگار خانۂ قدرت کا شاہکار بنا دیا بچے کو ہمراہ لے کر جب فقیر اپنا بھیس بدل کر دربار میں حاضر ہوا تو بیک وقت سینکڑوں نگاہیں بچے کی طرف اٹھ گئیں۔ چہرہ جمال کی تابندگی اور جلوۂ خداداد کی دلکشی دیکھ کر ہر شخص دم بخود رہ

گیا۔

بادشاہ کے جذبۂ شوق کا عجیب حال تھا۔ تختِ شاہی سے اٹھ کر بچے کو گود میں بٹھالیا۔ نا معلوم طور پر دل کی کشش تیز ہوگئی۔ رگوں کا خون جوش مارنے لگا۔

دربار کو منتظر چھوڑ کر آج پہلی بار بادشاہ حرم سرا میں داخل ہوا۔ ملکہ دوڑی ہوئی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہمراہ ایک مانوس شکل وصورت کا بچہ دیکھ کر ملکہ حیرت میں پڑ گئی۔ بار بار اسے دیکھتی رہی۔ بےساختہ بول اٹھی ——

''ذرا غور سے دیکھئے۔ اس کی پیشانی، ہونٹ ہو بہو مرحوم شہزادی کی طرح ہیں۔ جیسے بھی ممکن ہو یہ بچہ مجھے دلا دیا جائے''۔

بادشاہ نے جواب دیا: ——

''ویسے میں نے معلوم کرلیا ہے یہ ایک فقیر کا بچہ ہے۔ لیکن کوئی ماں اپنے بچے کو بخوشی کسی کے حوالے نہیں کرسکتی۔ اور کسی کی گود کا کھلونا جبراً چھین لینا اِنسانی مروت کے خلاف ہے''۔

ملکہ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا: ——

''میں ماِمتا کی ماری خود ہی گوارہ نہیں کرسکتی کہ کسی کے دل کا ٹکڑا زبردستی اس سے علیحدہ کیا جائے —— لیکن ایسا کرنے میں کیا حرج ہے کہ اس کے والدین کو بھی رہائش کا اِنتظام کردیا جائے —— ایک فقیر گھرانے کی معراج اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے ——!''

بادشاہ نے ملکہ کو سراہتے ہوئے کہا: ——

''تمہاری یہ رائے قرین قیاس ہے''۔

محل سرائے سے واپس آنے کے بعد بادشاہ نے فقیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ——

''ملکہ تمہارے بچہ کو اَپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں کیا تم اس کی اجازت دو گے؟''

فقیر نے جواب دیا: ——

''ملکہ کی خوشنودی کے خیال سے میں کسی طرح گوارہ بھی کرلوں تو اس کی ماں کبھی اسے برداشت نہیں کرسکے گی۔ وہ غریب بےموت مر جائے گی جہاں پناہ!''

بادشاہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا: ——

"میں بچے کو ماں سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر محل کے ایک گوشے میں تم لوگوں کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ بچہ بھی اپنی ماں سے علیحدہ نہ ہوگا اور ملکہ بھی اپنا جی بہلاتی رہیں گی ——!"

فقیر نے جواب دیا: ——

"میں واضح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ یہ صورت میری اہلیہ بھی پسند کر سکے گی یا نہیں؟ کیونکہ مسکینوں کیلئے شاہی محل کبھی راس نہیں آتے"۔

بادشاہ نے بھی فیصلہ کن انداز میں کہا: ——

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ ملکہ تمہاری اہلیہ کو جیسے بھی ہوگا راضی کر لیں گی"۔

محل کے عقبی دروازے کے اندر شاہی بیگمات کی مخصوص پالکی رکھی جاتی تھی۔ شاید آج ملکہ کہیں جانے والی تھی۔ خواصوں کے جھرمٹ میں آ کر ملکہ بیٹھ گئی۔ اور شاہانہ کروفر کے ساتھ پالکی آگے بڑھی۔

راستے کی پیشوائی کرنے والا خواجہ سراؤں کا ایک دستہ آگے آگے چل رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ملکہ کسی فقیر کی کٹیا میں جا رہی ہیں۔ اس خبر کو جس نے بھی سنا اسے سخت اچنبھا ہوا۔

کچھ لوگوں نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ شہزادی کے انتقال کے بعد سے فقیروں اور مسکینوں کا رابطہ شاہی خاندان سے بہت قریب ہو گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی خدا رسیدہ درویش کی زیارت کو ملکہ جا رہی ہوں۔ آخر اللہ والوں کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ بادشاہوں کے پاس جائیں۔ وہ تو خود اقلیم ولایت کے تاجدار ہوتے ہیں۔ سو بار بادشاہوں کو غرض ہو تو وہ ان کے قدموں کی خاک سے برکت حاصل کریں۔

پالکی شاہی باغ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ فقیر کی کٹیا تک جانے والا راستہ نہایت پر پیچ تھا۔ ایک خواجہ سرا نے آگے بڑھ کر فقیر کو آواز دی۔ فقیر اپنی کٹیا سے گھبرایا ہوا باہر نکلا۔ آج پہلی مرتبہ دروازے پر ایک پالکی دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔

خواجہ سرا نے فقیر کو مطلع کیا کہ پالکی میں ملکہ تشریف لائی ہوئی ہیں۔ وہ تمہاری اہلیہ

سے ملنا چاہتی ہیں۔تخلیہ کردو۔

یہ خبر سن کر فقیر کا دِل دھک سے ہو گیا۔ بدحواسی کے عالم میں شہزادی کو اطلاع دی۔ سالہا سال کا مخفی راز آج بے نقاب ہوا چاہتا تھا۔اَب چھپنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عقل ماؤف ہو گئی۔خون سوکھ گیا۔دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔اسی عالم میں شہزادی دم بخود کھڑی تھی کہ کٹیا کے اندر ملکہ داخل ہوئیں۔پہلی نظر پڑتے ہی آنکھ جھپک گئی۔

دوبارہ کھلی تو سکتے کا عالم طاری ہوا۔تھوڑی دیر کے بعد منہ سے ایک چیخ نکلی !شہزادی! فوراً ہی دوسری چیخ بلند ہوئی۔

نظر کا مشاہدہ دل مان گیا تھا۔لیکن دماغ انکار کر رہا تھا۔دفنائی ہوئی بیٹی کیونکر زندہ ہو سکتی ہے۔مرنے کے بعد آج تک کون واپس لوٹا ہے۔

ایک ناممکن بات کبھی واقع نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف نظر کا دھوکہ ہے۔ بیداری کا خواب یقیناً آنکھ کا کھلا فریب ہے۔

پھر ملکہ نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا پھر چیخیں بلند ہوئیں!

''کیا واقعی شہزادی ہو ــــــ میری لختِ جگر ہو ــــــ میری آنکھوں کی روشنی ہو ــــــ ہائے آج میری نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے ــــــ سچ بتاؤ تم کون ہو ــــــ؟''

شہزادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''یقین کیجئے ــــــ میں سچ مچ آپ کی شہزادی ہوں ــــــ میں آپ کی وہی بدنصیب بیٹی ہوں جسے مردہ سمجھ کر دفنا دیا گیا تھا ــــــ کرشمۂ قدرت سے میں دوبارہ جی اٹھی ہوں۔ حیرت نہ کیجئے۔عشق کی غیبی توانائی مجھے عالمِ برزخ سے یہاں تک کھینچ لائی ہے میں صرف ایک سچے اللہ والے فقیر کیلئے زندہ کی گئی ہوں ــــــ شاہی محل کیلئے تاہنوز مردہ ہوں۔

مرتے وقت میرا یہ جملہ آپ کو یاد ہوگا ــــــ کہیں پاس ہی سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز کان میں آئی ہے'' ــــــ سن لیجئے کہ مجھے مدفن کی خاک سے اٹھا کر وہ ٹوٹا ہوا شیشہ پھر جوڑ دیا گیا ہے!''

اس کے بعد شہزادی نے تفصیل کے ساتھ تمام سرگزشت سنائی۔دل تو پہلے ہی مومن

تھا۔ اَب واقعہ کی صداقت کے آگے دماغ نے بھی سپر ڈال دی۔

اَب بات کٹیا سے باہر نکل چکی تھی۔ بجلی کی طرح سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ چار سال کی مری ہوئی شہزادی اچانک جی اٹھی ہے۔

بادشاہ نے سُنا تو فرطِ خوشی میں پاگل ہو گیا۔ آگے پیچھے سارا شہر فقیر کی کٹیا کی طرف چل پڑا۔ القصہ مختصر کہ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ فقیر اور شہزادی کا جلوس نکالا گیا۔ جذبہ شوق میں سارا علاقہ ہل گیا تھا۔

کثرتِ اژدھام سے راستوں میں تِل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ قلعہ معلّٰی کے دروازے پر خیر مقدم کیلئے اراکین مملکت ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سمندر کی بیتاب موجوں کی طرح بادشاہ کے جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ جونہی قلعہ معلّٰی کے سامنے فقیر کی سواری پہنچی۔ تحسین و مرحبا کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ بادشاہ نے آگے بڑھ کر فقیر کو گلے سے لگایا۔ ساری دنیا خوشی کے عالم میں محو تھی۔ لیکن فقیر ایک رقت انگیز تصور میں ڈوبا ہوا تھا —— اسے بار بار یاد آرہا تھا کہ فقیر کا خیر مقدم کرنے کیلئے اس وقت جہاں بادشاہ کھڑا ہے اس جگہ ایک دن فقیر کھڑا تھا اور نہایت لجاجت کے ساتھ باریابی کی اجازت مانگ رہا تھا۔

نہایت اعزاز و توقیر کے ساتھ فقیر کو شاہی محل میں اتارا گیا۔ اَب وہ فقیر نہیں تھا۔ سلطنت کی آنکھوں کا تارا تھا۔ بادشاہ کا ولی عہد تھا۔ بلخ کا فرماں روا تھا —— لیکن نہیں —— وہ اَب بھی فقیر تھا —— ایسا فقیر جس کے آگے بادشاہوں کا جلال سرنگوں تھا —— تخت و تاج کا سب سے بڑا اعزاز قدم کی ٹھوکر پہ تھا۔

ولایت و فقر کی تاریخ میں ان کا مشہور نام ہے حضرت ابراہیم ادھم رضی اللہ عنہ۔

علّامہ ارشد القادری

ایک دیوانۂ عشق کی کہانی

(1)

تاجدارِ کشورِ ولایت حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کی مجلسِ وعظ کا ایک پُرسوز واقعہ عشق الٰہی کی کشش کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔

فرماتے ہیں کہ ایک دن بغداد کے سب سے وسیع میدان میں ان کا جلسۂ وعظ منعقد ہوا۔ جونہی انہوں نے تقریر شروع کی ہر طرف آہوں کا دھواں اُٹھنے لگا۔ خشیتِ الٰہی کی ہیبت سے کلیجے شق ہو گئے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو فرطِ اثر سے اشکبار نہ ہو۔

اثنائے وعظ میں احمد بن یزید نامی خلیفہ بغداد کا ایک مصاحب بڑے کروفر سے آیا اور ایک طرف مجلس میں بیٹھ گیا۔

اس وقت آپ یہ فرما رہے تھے کہ تمام مخلوقات میں انسان سے زیادہ ضعیف کوئی مخلوق کوئی نہیں ہے۔ لیکن باوجود اس ضعف کے وہ خدا کی نافرمانی کرنے میں سب سے زیادہ جری اور بہادر ہے۔

احمد ابن یزید کے دل پر آپ کے اس جملے کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہیں وہ گھائل ہو کے رہ گیا۔ دل کے قریب ایک سلگتی ہوئی آگ نے ریاست و امارت کی ساری نخوتوں کو آنِ واحد میں خاکستر کر کے رکھ دیا۔ اَب اس کے پہلو میں ایک مسکین درویش کا دل تھا۔ شاہانہ کروفر کی دنیا بدل چکی تھی۔

وعظ کی مجلس ختم ہونے کے بعد جب گھر پہنچا تو ایک نامعلوم ہیجان سے دل کی دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی، ساری رات بے چینیوں کے اضطراب میں کٹی۔ صبح ہوتے ہی وہ حضرت سریّ سقطی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ چہرے کی افسردگی، آنکھوں کا خمار، اور آواز کی بیخودی

بتا رہی تھی کہ یہ اپنے آپ میں نہیں ہے —— بڑی مشکل سے اتنے الفاظ کہہ سکا: ——

"حضور! رات کا نشر جگر سے پار ہو گیا ہے۔ عشقِ الٰہی کی آگ میں سلگ رہا ہوں خدا کے سوا ہر چیز سے دل کی انجمن کو خالی کر لیا ہے۔ اب مجھے وہ راستہ بتائیے جو بارگاہ یزدانی تک پہنچاتا ہے۔ میری کشتی بیچ منجدھار میں ہے۔ اسے ساحل تک پہنچا دیجئے"۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر تسکین کا ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا:

"صبر و شکیب سے کام لو رحمتِ الٰہی اس راہ کے مسافروں کی خود دستگیری فرماتی ہے۔

تم نے دریافت کیا ہے تو سُن لو کہ خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں: ——

عام راستہ تو یہ ہے کہ فرائض کی پابندی کرو۔ سجدۂ عبادت کے کیف سے رُوح کو سرشار رکھو، گناہوں سے بچو، شیطان کی پیروی سے اپنی زندگی کو محفوظ رکھو۔ مشاغل دنیا سے تعلق رکھتے ہوئے سرکار مصطفٰی کی غلامی کا حق ادا کرو۔

اور خاص راستہ یہ ہے کہ دنیا سے بے تعلق ہو جاؤ، یادِ الٰہی میں اس طرح بے خود ہو جاؤ کہ خدا سے بھی سوائے خدا کے دوسری چیز کی طلب نہ رکھو"۔

حضرت سری سقطی کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اچانک حضرت احمد بن یزید کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ عشقِ الٰہی کے اضطراب میں بے خود و مستانہ وار جیب و دامن کی دھجیاں اڑاتے صحرا کی طرف نکل گئے۔

(2)

کچھ دنوں کے بعد احمد بن یزید کی ماں روتی ہوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آبدیدہ ہو کر عرض کیا: ——

"حضور! میرا ایک ہی فرزند تھا جسے دیکھ کر میں اپنی آنکھوں کی تشنگی بجھاتی تھی۔ چند دنوں سے وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ ہمارے پڑوسیوں نے خبر دی ہے کہ ایک شب وہ آپ کی مجلس وعظ میں شریک ہوا تھا۔ اسی وقت سے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ آپ کے چند جملوں نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ آہ! اب مجھے ساری عمر اپنی اولاد کا ماتم کرنا ہوگا"۔

حضرت نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ——

''اے ضعیفہ! صبر و شکر سے کام لے۔ تیرا بیٹا ضائع نہیں ہوا ہے۔ وہ جب بھی میرے پاس آئے گا میں تجھے خبر دوں گا۔ خدا کی طرف بڑھنے والوں پر ماتم کا انداز اختیار کرنا خدا کی وفادار کنیزوں کا شیوہ نہیں ہوتا''۔

چند ہی دنوں کے بعد گرد آلود چہرے، پراگندہ بال اور ایک سرشار دیوانے کی سج دھج میں احمد ابن یزید، حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی حضرت نے جلالِ عشق کا تیور پہچان لیا۔ اٹھ کر سینے سے لگایا۔ خیر و عافیت دریافت کی اور بہت دیر تک اُپنے پاس بٹھائے رکھا۔

اسی دوران میں ان کی ماں کو اطلاع بھجوائی کہ تمہارا بیٹا آ گیا ہے۔ آ کر ملاقات کر لو، ماں کو جیسے ہی خبر ملی اپنی بہو اور پوتے کو ساتھ لئے روتی پیٹتی اپنے بیٹے کے پاس آئی اور اس کے چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:——

''بیٹا تو اپنی بوڑھی ماں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔ تیرے فراق میں روتے روتے ہمارے آنچل بھیگ گئے۔ انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں۔ چل واپس چل اُپنے گھر کو آباد کر۔ ہماری امیدوں کا چمن مرجھا گیا ہے پھر سے اسے شاداب کر''۔

بیوی نے فرطِ غم سے منہ ڈھانپ لیا۔ اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہا:——

''میرے سرتاج! آخر ہم سے کیا بھول ہوئی کہ تم اس طرح روٹھ کر چلے گئے جیتے جی اُپنے بچے کو تم نے یتیم بنا دیا۔ تمہارے سوا ہمارے ارمانوں کا کون نگران ہے''۔

ماں اور بیوی نے ہزار منت و سماجت کی لیکن دیوانہ عالم ہوس کی طرف پلٹنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ رُوح پر سرورِ عشق کا اتنا گہرا نشہ تھا کہ ہزار جھنجھوڑنے کے بعد بھی عالم نہیں بدلا۔

(3)

ایک دیوانۂ عشق کا کیف دیکھنے کیلئے سارا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ دیوانہ ایک بار پھر بیخودی کی حالت میں اٹھا اور صحرا کی طرف رُخ کیا۔ قدم اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے بیوی نے دامن تھام لیا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگی:——

''ہماری آرزوؤں کا خون کر کے جانا ہی چاہتے ہو تو اکیلے مت جاؤ اپنے اس بچے کو

بھی ہمراہ لے لو!"

اس آواز پر حضرت احمد بن یزید کے قدم رک گئے۔ انہوں نے اپنے ننھے منے بچے کے جسم سے قیمتی لباس اتار کر اپنا پھٹا ہوا کمبل اس کے جسم پر لپیٹ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں زنبیل دی اور دوسرا ہاتھ پکڑ کر جونہی اسے اپنے ہمراہ لے کر چلے، بیوی اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ سارا مجمع اس رقت انگیز عالم کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ ماں کو اپنے لختِ جگر کی جدائی برداشت نہ ہو سکی۔ بے تحاشا دوڑ کر اس نے بچے کو باپ کے ہاتھ سے چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

حضرت احمد بن یزید نے پلٹ کر ایک بار اپنے بچے کو دیکھا اور پلکوں کا آنسو سینے کی تپتی ہوئی خاکستر میں جذب ہو کر رہ گیا۔ فضا میں ایک دردناک نعرے کی آواز گونجی اور لوگوں کے دِل ہل گئے، آنکھ کھلی تو حضرت احمد بن یزید نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

(4)

چاندنی رات تھی۔ حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر سلام کیا۔ اور کہا کہ میں احمد بن یزید کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا ہے کہ میری رحلت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ایسے نازک مرحلے میں حضور کی تشریف آوری میری تسکین خاطر کا ذریعہ ہوگی۔

یہ خبر سُن کر حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ آبدیدہ ہو گئے۔ حاضرین مجلس سے کہا کہ خدا کا ایک مسکین بندہ جس کے نالۂ شبینہ سے صحرائے عشق میں ایک شور برپا تھا۔ افسوس کہ آج اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ اَب رات کی تنہائیوں کا پُرسوز فریادی اور ویرانوں کا عبادت گزار ہمیشہ کیلئے دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ چلو اس چراغ حرم کی بجھتی ہوئی لو کو آخری بار دیکھ آئیں۔ رحمت پروردگار کے نزول کی یہ بہت اہم گھڑی آ گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اچانک اُٹھے اور اس اجنبی شخص کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ بغداد کے ایک مشہور قبرستان میں پہنچ کر وہ اجنبی شخص رُک گیا۔ اور ایک نحیف و لاغر انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:——

"یہی ہے وہ عالم جاوید کا مسافر جس نے دمِ رخصت آپ کو آواز دی ہے"۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے بالین کے قریب بیٹھ کر آواز دی۔ احمد ابن یزید نے آنکھیں کھول دیں اور ہچکی لیتی ہوئی سانس میں کہا:——

"میرے مرشد! گواہ رہنا کہ میں توحید الٰہی اور رسالت محمدی کے اقرار پر اپنا دم توڑ رہا ہوں۔ ایک بندۂ سیہ کار اپنے رب کے حضور اس حال میں جا رہا ہے کہ اس کا نامۂ عمل گناہوں سے بوجھل ہے۔ اسے زندگی کی طویل مہلت ملی لیکن اپنے پروردگار کی خوشنودی کا وہ کوئی سامان نہ کر سکا"۔

یہ کہتے کہتے آواز حلق میں پھنس گئی۔ آنکھوں سے دو موتی ڈھلکے اور گریبان کی دھجی میں جذب ہو گئے۔ آنکھیں بند ہوتے ہی لبوں میں ایک جنبش پیدا ہوئی اور کلمۂ شہادت کی مدہم سی آواز، روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

حضرت سری سقطی سے مرگِ عاشق کا یہ دردناک منظر نہیں دیکھا گیا۔ فرطِ غم سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں——آسمان کی طرف منہ کر کے کہا:——

"تیری ادائے بے نیازی کے قربان! باغیوں کو حریر و دیبا کی مسند اور پھولوں کی سیج پر موت آتی ہے اور تیری مملکت کے وفا شعار مسکینوں کو ایک ٹوٹا ہوا بوریا بھی میسر نہیں ہے"۔

یہ کہہ کر تجہیز و تکفین کے ارادے سے شہر کی طرف جونہی پلٹے، دیکھا کہ ہر طرف سے لوگوں کا ایک ہجوم چلا آ رہا ہے۔

اچنبھے سے دریافت کیا——"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں——؟"

لوگوں نے جواب دیا:——

"ابھی ابھی آسمان سے ایک غیبی آواز سنائی پڑی ہے کہ جو لوگ خدا کے ایک ولی مقرب کے جنازے میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ شونیزیہ کے قبرستان میں جمع ہو جائیں——اس آواز کو سن کر سارا بغداد امنڈا چلا آ رہا ہے"۔

حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ نے یہ خبر سن کر پھر آسمان کی طرف رُخ کیا——اور کہا:——

"تیری شان بندہ نوازی کے قربان! زمین کی ننگی پیٹھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے

والوں کا یہ اعزاز! عمر بھر جو دشت غربت میں زندگی کی شام و سحر گزارتا رہا آج سارا بغداد اس کے قدموں میں تُو نے جمع کر دیا۔ دُنیائے فانی میں جس عاشق گمنام کی توقیر کا یہ حال ہے۔ عالم جاوید میں اس کی شوکتوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

سچ کہا ہے تیری کتاب مجید نے کہ اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

علاّمہ ارشد القادری

دو شہیدانِ محبت

کلکتہ کا ایک تاریخی واقعہ

زلفوں سے تری زنجیروں تک، زنجیروں سے پھر دار و رسن
ناموس محبت کی خاطر دیوانے کہاں تک آپہنچے

ابھی وہ جوان تھا، اُس کی آرزوئیں بھی جوان تھیں اور اُمنگیں بھی جوان تھیں۔ دُنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بھی اسے میسر تھے اور دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی بھی تھی ——— لیکن وہ مردِ مومن تھا۔ اور اس کی غیرت ایمان محبت رسول کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز کو پرکاہ سمجھتی تھی ——— وہ اپنے رسول کی ایک ایک ادا پر قربان ہو جانا چاہتا تھا۔ رسول کی محبت اس کے دل میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ اَب اس سے دست کش ہونا اس کے بس سے بھی باہر تھا۔ وہ اس محبت کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس محبت کی پرورش کرتے رہنے کا تہیہ کر لیا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کی ساری پونجی اسی محبت کی نذر کر دے۔

اس نے کسی دار العلوم سے دستارِ فضیلت حاصل نہیں کی تھی۔ کسی شیخ الحدیث کی بارگاہ علم و فضل میں زانوئے تلمذ طے کرنے کا بھی کوئی موقعہ اسے میسر نہیں آیا تھا۔ کسی بحر العلوم سے اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں تھا کہ کم از کم اسی نسبت پر وہ فخر کر سکتا۔ اس کی پیشانی پر سجدوں کا کوئی ٹریڈ مارک بھی نہیں تھا۔ کم از کم یہی ہوتا کہ اس کے کرتہ کا دامن اس کے ٹخنوں کی بلائیں لیتا ہوتا، تو اتفاق سے یہ بات بھی نہیں تھی ——— اس کا نامۂ اعمال بیوہ کی مانگ کی

طرح صاف اور سپاٹ تھا، افشاں سے بھی محروم، سیندور سے بھی بے نیاز۔ اس کی عملی زندگی مفلس کی جیب کی طرح خالی تھی، نہ کھنکتے ہوئے سکے تھے نہ بجتی ہوئی ریزگاریاں۔ اس کی علمی وجاہت لاوارث میت کی طرح بے گور و کفن تھی اور اس کا خاندانی وقار ایک دھوپ تھی جو آفتاب کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی —— لیکن اس کے پاس ایک ڈگری تھی، وہ یہ کہ وہ مسلمان تھا۔ اور اس کی تحویل میں محبت رسول نام کی ایک دولت تھی، جس کو بڑی احتیاط سے اس نے اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپا رکھا تھا۔ اس محبت کو وہ ہر قسم کے دنیوی صلاح و فلاح کا ضامن سمجھتا تھا اور اسی کو اُخروی نجات کا ذریعہ۔

دن پر دن گذرتے گئے۔ صبح و شام نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں دُنیا میں ایک سے ایک انقلاب آئے۔ کتنی ہی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن نہ شام کا دھندلکا بدلا، نہ صبح کا سویرا —— رات پہلے کی طرح اَب بھی پُراسرار تھی۔ دن کا اُجالا آج بھی فروغ دیدۂ امکان بنا ہوا تھا۔ کہکشاں کی مانگ میں آج بھی افشاں چنی ہوئی تھی۔ چاند کی روپہلی کرنیں آج بھی چاندی برسا رہی تھیں۔ اور ستاروں کا قافلہ آج بھی رواں دواں تھا۔ نسیم سحر آج بھی کلیوں کو گدگداتی تھی اور پھولوں کو ہنسنے کی ادا آج بھی بھولی نہیں تھی —— لیل و نہار کی گردشیں اپنی جگہ مسلّم۔ زمانے کے انقلابات بجا اور دُرست۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس طرح رات کی پُراسرار خموشی پر اَب تک کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکی تھی، نکہتوں سے پھولوں کے پیرہن میں رہنے کا استحقاق چھینا نہیں جا سکتا تھا اور پارے سے اس کی کیفیت سیمابی بدلی نہیں جا سکتی تھی —— اسی طرح امیر احمد کے دل پر بھی کسی کا داؤ نہیں چل سکا تھا، اس کے دل سے دولت محبت چھینی نہیں جا سکتی تھی۔ محبت رسول، اس کی فطرت بن چکی تھی، اس کی تقدیر اور اس کا ایمان بن چکی تھی۔ اور فطرت بدلا نہیں کرتی، تقدیر پر کسی کا جادو نہیں چلتا، اور ایمان کی شمع فروزاں کسی کے بجھائے نہیں بجھتی۔

امیر احمد کے دل میں ایمان کی جو چنگاری دبی ہوئی تھی، وہ وقت کے ساتھ ساتھ شعلۂ

جوالہ بنتی گئی۔ امیر احمد اپنے خونِ جگر سے اس شجرِ محبت کو سینچتا رہا، قلب کے انتہائی خلوص اور دل کی شدید سچائی کے ساتھ۔ اس کی امیدوں کا مرکز تنہا ایک ذاتِ رسالت تھی۔ وہ اپنے دل میں اسی ذاتِ شریف کیلئے والہانہ جذبہ رکھتا تھا۔ اس کی جبینِ نیاز میں ہزاروں سجدے اسی ایک چوکھٹ کیلئے تڑپا کرتے تھے۔ اس کی آنکھیں اسی کے صحیفۂ رخ کا نظارۂ جمال کرنا چاہتی تھی۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی۔ کسی طرح وہ اس شمعِ نبوت پر پروانہ وار قربان ہو جائے۔ کسی طرح ان کا نام بھی اس محبوبِ دلنواز کے عاشقوں کی فہرست میں مندرج ہو جائے کسی طرح وہ بھی ان کی ایک نگاہ لطف کا استحقاق حاصل کر سکے۔

زمانے نے ایک کروٹ اور لی —— وقت کا قافلہ ایک قدم اور چلا اور اب امیر احمد زندگی کی اکیسویں منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔

یہ عمر امنگوں کی پیداوری کی ہوتی ہے اس عمر میں تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں اور ولولوں کو شہپر پرواز مل جاتا ہے۔ امیر احمد کو بھی امیدوں نے سبز باغ دکھائے، آرزوئیں جھولے جھلانے لگیں۔ دنیا ایک حسین پیکر میں اس کے سامنے بھی آئی۔ اور کچھ دنیا کی دلفریبیوں نے اُسے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ کچھ گھریلو ضرورتوں نے اُسے دنیا حاصل کرنے کی ترغیب دی۔

وہ سوچنے لگا۔ اسے بھی حق پہنچتا ہے کہ اپنی جوان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا سے بقدر حوصلہ وظرف فیضیاب ہو۔ داعیاتِ نفس اور تقاضائے شباب کا پورا کرنا بھی لازمۂ حیات ہے اس کی بوڑھی ماں جو اس امید پر اس کے جوان ہونے کی راہ دیکھ رہی ہے کہ وہ اس کے بڑھاپے میں عصائے پیری ہوگا۔ اس کی خدمت کا وقت آخر کب آئے گا؟ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے یتیم بھائی بہنوں کی تربیت سے کب تک پہلو تہی کرے گا؟ آخر وہ وقت کب آئے گا جب وہ اپنی جوان بہنوں کے ہاتھ پیلے کرے گا؟ —— لیکن ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ کس طرح اپنے فرائض سے سبکدوش ہو؟ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر

آ ہو نے کیلئے کون سا قدم اٹھائے؟ اور اپنی زندگی کو خوشحال اور بامراد بنانے کیلئے کون سی صورت اختیار کرے؟ —— کہ اچانک ایک عجیب تصویر اس کی نگاہوں سے گذری، ایک غیر متوقع منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ جس پیکر نور کو وہ مصورِ فطرت کا سب سے حسین شاہکار سمجھتا تھا کاغذ کے ایک ٹکڑے پر مرتسم ہے۔ گویا سمندر کوزے میں بند ہو گیا ہے اور بشریت کاغذ پر اُتر آئی ہے —— اس کو سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ جس جسم لطیف کا سایہ تک نہ تھا، اس کی تصویر کاغذ پر کیسے اُتر سکتی ہے؟

پھر اس نے وہ سطریں پڑھیں جو بطور تعارف قلمبند ہوئی تھیں وہ الفاظ پڑھے، جو بطور القاب استعمال کیے گئے تھے اور وہ دلخراش فقرہ پڑھا جس کو زیب عنوان بنایا گیا تھا اور جس سے صاحب تصویر کی جلالت اسی کا پتہ چلتا تھا —— اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ کسی گستاخ نے اس کے محبوب کا کارٹون بنایا ہے۔

وہ محبوب، جو کائنات کی عظیم و جلیل شخصیت ہے، جو دنیا کا نجات دہندہ بھی ہے اور فرمانروائے گیتی بھی —— جس نے انسانیت کی سب سے زیادہ خدمت کی اور جو دنیا والوں کو جینے کا سب سے اچھا سلیقہ سکھا گیا —— اسی کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ اسی کا مذاق اڑایا گیا تھا۔

امیر احمد غم سے نڈھال ہو گیا۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ آج اس کے دل پر ایک چوٹ لگی تھی۔ اس کے قلب کو ایک صدمہ پہنچا تھا۔ ہجوم غم نے اس کی شکل پاگل جیسی بنا دی اس کے دل کا سکون چھن گیا، اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سلب ہو گئی۔

کتاب اس کے سامنے ہی تھی۔ اس پر چھپی ہوئی تصویر اسے برابر دیکھے جا رہے تھی اور اس کی نظریں تیر و نشتر بن کر اس کے دل میں اتر رہی تھیں۔ وہ شدت درد سے چیخ اُٹھا۔ گھاؤ گہرا تھا اس لئے اس کی تکلیف بھی ناقابل برداشت تھی۔ اس کی روح زخم کی اس ناقابل برداشت اذیت سے بلبلا اٹھی۔ اس کے ہاتھ سے پیمانہ صبر چھوٹ گیا۔ اس کی ہمت

جواب دے چکی۔ غم غلط کرنے کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ سکون کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ لیکن نہ خلوت کدہ اسے سکون بخش سکا، نہ جلوت میں اسے سکون میسر آیا۔ وہ پگڈنڈیوں پر بھی چلا شاہراہوں پر بھی دوڑا۔ سکون وہاں بھی نہ تھا۔ وہ احباب کی بزم طرب میں بھی شامل ہوا اور اپنے شہر کی تفریح گاہوں کی بھی اس نے سیر کی سکون کی تلاش وہاں بھی بے سود تھی۔ اس کی جراحت دل کا اندمال وہاں بھی نہ تھا، وہاں بھی اس کا غم غلط نہ ہو سکا۔ اور اب اس نے طے کر لیا کہ وہ جلد سے جلد کلکتہ پہنچے گا، جہاں سے وہ رسوائے زمانہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ جہاں سکون اُس کا انتظار کر رہا ہے، جہاں اسے ابدی راحت میسّر آئے گی اور اُس کا زخم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مندمل ہو جائے گا۔

تانگہ ہوا سے باتیں کرتا ہوا اسٹیشن کو جا رہا تھا۔ پشاور کی گلیاں آج ہمیشہ کیلئے چھوٹ رہی تھیں ——— لیکن امیر احمد کو اس کا غم نہیں تھا۔ اس کی جبینِ ہمت پر شکن بھی نہ تھی۔ اس کے پائے استقامت میں تزلزل بھی نہ تھا۔ وہ لڑکھڑایا بھی نہیں ڈگمگایا بھی نہیں۔ وہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ جیسے دولہا بارات لے کر چلتا ہے، جیسے ندی دریا کی سمت دوڑتی ہے، جیسے چکور چاند کی طرف بھاگتا ہے۔

اس کا دوست عبداللہ اس کے ساتھ ہی تانگے پر سوار تھا امیر احمد اس سے کہہ رہا تھا میں نے زندگی کی آخری سانس تک تم سے دوستی نبھانے کی قسم کھائی تھی، میں نے تمام عمر رفاقت کا وعدہ کیا تھا اور میں نے زندگی کے ہر موڑ پر تمہارا ساتھ دیا بھی۔ میں نے تم سے بے پناہ محبت کی اور میرا سارا پیار صرف تمہارے لئے وقف رہا ——— لیکن آج میں پہلی بار تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنے آقا پر صدقے ہو جاؤں۔ ان کی عزت و حرمت پر کٹ مروں اور ان کی بارگاہ ناز میں نقد جاں بھی نذر کر دوں ——— کلکتہ میں اسی مقصد سے جا رہا ہوں۔ شوق شہادت ہی مجھے وہاں لے جا رہا ہے۔ میرے بعد تم میری بوڑھی ماں کا خیال رکھنا اور اگر تم سے ہو سکے تو میرے یتیم بھائیوں اور بے سہارا بہنوں کی خبر

گیری کرنا۔ یہ میری آخری گذارش ہے“۔

سلسلہ کلام جاری تھا اور عبداللہ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب امیر احمد اپنی گفتگو تمام کر چکا تو عبداللہ نے کہا:

”اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے ——— میں زندگی کی آخری منزل تک تمہارے ساتھ ہوں۔ کلکتہ تنہا تم ہی نہیں جا رہے ہو، تمہارا عبداللہ بھی تمہارا رفیق سفر ہے۔ اپنے آقا پر قربان ہو جانے کی تمنا اکیلے تمہارے ہی دل میں نہیں مچل رہی ہے۔ اس باب میں میں بھی تمہارا شریک کار ہوں۔ شہادت کی تڑپ میرے دل میں بھی ہے، میں بھی اپنے آقا پر قربان ہونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں ——— شمع پر کچھ تمہارا اجارہ نہیں ہے کہ اکیلے تم ہی اس پر فدا ہو جاؤ۔ یہ سعادت تو کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ شمع پر جان دینا پروانوں کا پیدائشی حق ہے اور اس حق سے کوئی بھی اسے محروم نہیں کر سکتا۔ تمہارے آقا صرف تمہارے آقا نہیں ہیں وہ ہم سبھوں کے آقا ہیں۔ ان کے بار احسانات سے تنہا تمہاری ہی گردن خم نہیں ہے، ہم سب ان کے منت کش کرم ہیں۔ ان کا جمال دلفروز ہماری آنکھوں کو بھی فروغ بخش رہا ہے اور ان کی تجلیوں سے ہمارا خانۂ دل بھی معمور ہے۔ میدان حشر کی تیز دھوپ میں ان کے سایۂ رحمت کی تلاش تنہا تمہی کو نہیں کرنی ہے۔ قبر کی منزل اور پل صراط کے سفر میں ان کے سہارے کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔ ان کے دامن رحمت میں ہمیں بھی پناہ لینی ہے اور انہی کی کرم فرمائیوں پر ہماری نجات بھی منحصر ہے ——— پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو سعادت تم تنہا حاصل کرنا چاہ رہے ہو، میں اس سے محروم رہ جاؤں؟ میں تمہارے ساتھ ہی کلکتہ چل رہا ہوں۔ ہم دونوں ایک ساتھ جام شہادت نوش کریں گے۔ زندگی میں بھی ہمارا تمہارا ساتھ رہا ہے، مرنے کے بعد بھی ہم تمہارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا تمہارا انجام بھی ایک ہو۔ قبر سے ہم دونوں ساتھ ہی اٹھیں، ساتھ ہی جنت کو چلیں اور ہم دونوں کے آقا ہم دونوں کی قربانیاں قبول فرما لیں اور ایک ہی ساتھ ہم دونوں کو اپنے دامن رحمت میں پناہ دے دیں“۔

ابھی عبداللہ کی بات پوری نہیں ہو پائی تھی کہ امیر احمد نے اُسے ٹوک دیا ——— "تم بھی چلے جاؤ گے تو ہم دونوں کی بوڑھی ماؤں کا کیا ہوگا؟ کس کو ہماری بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ہوگی؟ کون ہمارے بھائیوں کی دستگیری کرے گا ———؟

عبداللہ ایک مرتبہ پھر گرجا۔"تمہاری عقل ماری گئی ہے۔تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں کارساز مطلق کوئی اور ہے۔ بھلا سوچو تو! جو خدا جنین کو رحم مادر میں اس کی غذا پہنچا رہا ہے، وہ جوانوں کی تربیت سے کیسے غافل ہو جائے گا؟ پھر جان دینے والوں کو یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس کے بعد دنیا کا کیا حال ہوگا؟ حضرت امام حسین علیہ السلام جس وقت میدان کرب و بلا میں جان دے رہے تھے۔انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ ان کے بعد ان کی سکینہ کس طرح رہیں گی؟ بیمار زین العابدین کیسے اپنی زندگی کے ایام بسر کریں گے؟ شہر بانو پر کیا گذرے گی؟ گلشن بتول کے نونہالوں اور باغِ زہرا کی کلیوں کا کیا بنے گا؟

جان دینے والے تو بس جان دینا جانتے ہیں۔ان کو اس سے کیا غرض کہ وہ اپنے پیچھے کتنے متعلقین چھوڑ رہے ہیں اور کس حال میں چھوڑ رہے ہیں؟"

پشاور کا اسٹیشن آ گیا تھا، اس لئے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دونوں دوست پلیٹ فارم پر لگی ہوئی گاڑی کی طرف چل پڑے۔

کلکتہ ایک عظیم شہر ہے۔ جہاں دن رات ہُن برستا ہے۔ جہاں روزانہ لڈو پھوٹتے ہیں، جہاں ہر وقت چاندی کٹتی ہے ——— کلکتہ دیکھنے کی آرزو ایک مدت سے ان دونوں کو تھی ——— لیکن اب تک اس کا موقعہ انہیں نہیں ملا تھا۔آج ان کی ٹیکسی کلکتہ کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی کلکتہ میں ان کیلئے کوئی کشش نہیں تھی۔ان کے دل میں تو کچھ اور ہی لگن تھی۔ یہ اسٹیشن سے سیدھے لور چیت پور روڈ آئے اور موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانہ میں قیام پذیر ہوئے۔

انہوں نے یہاں اپنا سامان اتارا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس محلّہ کی طرف چلے، جہاں سکون ان کا انتظار کر رہا تھا، اور طمانیت قلب ان کیلئے چشم براہ تھی۔انہوں نے اس کتاب

کے ناشر سے ملاقات کی، جس نے ان کا سکون غارت کیا تھا اور وفا کیشو کے جذبۂ محبت کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کتاب کا ناشر ہی اس کا مصنف بھی تھا اور اسی کے زیرِ اہتمام اس کی طباعت بھی عمل میں آئی تھی۔

انہوں نے کہا: "اپنی کتاب سے فلاں حصہ نکال دو اس سے ہم مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ایک معذرت نامہ بھی شائع کرو تا کہ جن لوگوں کی تم نے دل آزاری کی ہے، ان کو کچھ تسکین ہو جائے"۔

کتاب کے ناشر نے کہا: "کتاب میں ایک تصویر شائع ہو گئی تو کون سی قیامت آ گئی؟ تمہارے رسول کے خلاف ایک آدھ جملہ لکھ دیا گیا تو کیا ہو گیا؟ تم کہتے ہو کہ میں نے غلطی کی ہے؟ لیکن میں غلطی ماننے کیلئے تیار ہی نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک ہی لکھا ہے اگر میری تحریر سے کسی کی دل آزاری ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا کہ معافی نامہ شائع کروں۔ اگر میری غلطی تسلیم بھی کی گئی تو اس کی سزا اتنی سنگین نہیں —— میں اپنی غلطی کا ڈھنڈورہ نہیں پیٹ سکتا۔ تم جا سکتے ہو۔ تم میری دکان سے نکل جاؤ، میرا دماغ مت چاٹو"۔

امیر احمد کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں، اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس کی رگیں تن گئیں اور وہ بے قابو ہو گیا۔ غلطی اور اس پر اصرار! گستاخی اور وہ بھی آقا کی شان میں؟ اس نے ایک جست کی، عبد اللہ بھی اپنی جگہ سے اُچھلا۔ دونوں اس نامراد پر ٹوٹ پڑے۔ پھر ایک بجلی تھی جو چمک گئی۔ ایک خنجر تھا جو کلیجہ میں اُتر گیا۔ اور اب یہ دونوں سڑک پر کھڑی ہوئی ٹریفک پولیس سے کہہ رہے تھے "میں نے خون کیا ہے۔ میں قاتل ہوں مجھے گرفتار کر لو" پولیس مارے خوف و دہشت کے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب انہوں نے قریب کے تھانے کو فون سے اطلاع دی "میں فلاں مقام پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں نے خون کیا ہے۔ تم یہاں آ جاؤ تا کہ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر سکوں"۔ پھر دونوں گرفتار ہو گئے۔

عدالت میں آج ان دونوں کی پہلی پیشی تھی۔ آج ان کا مقدمہ کھلا تھا۔ ماہر قانون

وکیلوں نے انہیں قانون کی زور سے بچا لینے کیلئے اپنی خدمات مفت پیش کیں۔ رؤسائے شہر نے اُن کے مقدمہ کی پیروی کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ بچوں نے کئی دنوں سے مٹھائی اور چاکلیٹ کے سارے پیسے بچا بچا کر آج ہی کیلئے رکھ چھوڑے تھے۔ خواتین نے اپنے اپنے کانوں کی بالیاں آج ہی کیلئے اتار رکھی تھیں۔ سارا نگر یہ چاہتا تھا کہ یہ دونوں عدالت کی نگاہ میں مجرم نہ ثابت ہوں۔ کسی طرح یہ قانون کی رُو سے بچ جائیں۔ خود حاکم کو بھی ان دونوں کی معصومیت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ خلاصی پا جائیں لیکن دشواری یہ تھی کہ خود یہ دونوں ایسا نہیں چاہتے تھے، شہادت کا شوق ان کے سروں پر سمایا ہوا تھا اور یہ جلد سے جلد پھانسی کے تختے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ آقا پر قربان ہو جانے کی تڑپ انہیں بے چین کیے دے رہی تھی ——— ان سے کہا گیا کہ کم از کم اپنی زبان سے اقبال جرم نہ کریں۔ صرف ایک بار کہہ دیں کہ انہوں نے خون نہیں کیا۔ لیکن دونوں یہی کہتے رہے۔ ”میں نے خون کیا ہے میں ہی قاتل ہوں۔ میں نے ہی اس گستاخ کو اس کی گستاخی کی سزا دی ہے“۔

کبھی کبھی امیر احمد، عبداللہ سے اُلجھ پڑتا تھا۔ ”زندگی میں تو میرا ساتھ تم نے دیا ہی ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ مرنے کے بعد بھی ساتھ دو؟ ایک ساتھ مرنے کی قسم تو تم نے بھی نہیں کبھی کھائی تھی۔ مرنے میں شرکت کا وعدہ تو ہم میں سے کسی نے نہیں کیا تھا؟ تم کیوں جان دے رہے ہو؟ ابھی زندگی کی اٹھارہ ہی بہاریں تو تم نے دیکھی ہیں ابھی تو تم نے شباب کی منزل میں قدم رکھا ہے؟ آقا پر نثار ہونے کا موقع پھر آئے گا۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں تم کسی اور طریقے سے ان کو خوش کر لینا۔ اپنی جوانی پر رحم کرو اور مرنے کا خیال چھوڑ دو، یہ دن تمہارے مرنے کے نہیں ہیں“۔

عبداللہ نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بس کرو۔ بس کرو! تم نے کبھی مجھے دکھ نہیں دیا۔ تم سے ہمیشہ مجھے سکھ ہی پہنچا ہے۔ لیکن دم آخر میرا دل توڑ رہے ہو۔ تم مجھے زندگی کی سب سے بڑی سعادت سے محروم رکھنا چاہتے ہو۔ تم میں خود غرضی آ گئی ہے ——— تم نہیں چاہتے کہ میں بھی تمہارے ساتھ کامیابی سے

ہمکنار ہو جاؤں اور ہمارے آقا اپنے دامنِ رحمت میں ہمیں بھی جگہ دے دیں۔

تمہارے لئے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ تم یہاں جان ہی دینے کیلئے آئے تھے۔ آقا پر نثار ہونے کا جذبۂ بے اختیار ہی تمہیں یہاں لایا تھا؟ تم نے اقدامِ قتل کیا اور قصاص جرم میں اپنی جان دے ڈالنے کی تمہاری نیت بھی ہے۔ اگر اعمال کی مقبولیت کا انحصار نیتوں پر ہے اور نیتوں کی بنیاد پر اعمال کے فیصلے بھی ہوتے ہیں، تو تمہاری نجات کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

جہاں تم نے مجھ پر اتنے احسانات کیے ہیں، وہاں ایک احسان یہ بھی کرو کہ پھانسی کے تختے پر مجھے ہی لٹکنے دو۔ تم کہہ دو کہ تم نے جرم نہیں کیا۔ میں تمہارے اس احسان کا معاوضہ اس طرح چکاؤں گا کہ جان دینے کے عوض مجھے جو اجر ملے گا۔ وہ تمہیں ہبہ کرتا ہوں۔ میں اپنے آقا سے صرف ان کے قدمِ ناز پر سر رکھنے کی اجازت مانگ لوں گا۔ ان کی آغوش میں تم ہی بیٹھو گے۔ موجۂ نور میں تم ہی نہاؤ گے، مجھے ان تجلّیوں کی ایک آدھ کرن چاہیے۔ رحمت کی گھٹائیں تم ہی پر برسیں گی، میں چند چھینٹوں ہی کا متمنّی ہوں —— اور آخر ایثار کا بھی تو کوئی صلہ ہے؟ مجھے یقین ہے کہ دینے والا جب دینے پر آئے گا تو مجھے اس ایثار کا صلہ ضرور عنایت کرے گا جو میں تمہارے ساتھ کرنے والا ہوں۔

تم پر بہت ساری ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اپنے بھائی بہنوں کی ناکتخدائی کا احساس کرو وہ دیکھو! تمہاری ماں کا بڑھاپا تمہیں آواز دے رہا ہے —— جان دینے کی ہوس اگر اس غرض سے تھی کہ شہنشاہِ دو عالم ﷺ کے الطافِ خسروانہ سے سرفراز ہونا چاہتے تھے، تو وہ مقصد تو تمہیں حاصل ہی ہو رہا ہے۔ میں اپنی جان قربان کرنے کا صلہ تمہارے ہی نذر کر رہا ہوں —— اَب بھی تو تم اپنی ہٹ سے باز آؤ —— اب بھی تو اپنے ارادے ترک کر دو؟"

امیر احمد نہایت سنجیدگی سے عبداللہ کا مدعائے دل سنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ چونک اٹھتا تھا۔ کوئی کوئی بات اُسے عجیب ہی لگ رہی تھی۔ عبداللہ اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ عبداللہ کا کوئی راز اس سے چھپا ہوا نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ عبداللہ جھوٹ نہیں بولتا۔ لیکن آج وہ اسی کی زبان سے سن رہا تھا کہ قتل اس نے نہیں کیا ہے۔ یہ بات اس کے خیال میں واقعہ کے ایک دم

خلاف تھی۔ اس نے عبداللہ پر ایک تیز نگاہ ڈالی اور بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔

"عبداللہ! میں جام شہادت جلد سے جلد نوش کرنا چاہتا تھا۔ میں اس گستاخ سے اس لئے الجھ پڑا تھا کہ اسی کے ہاتھ سے وہیں پر قتل ہو جانا چاہتا تھا، میں اس سے اس وقت تک لڑتا رہتا جب تک وہ اپنا فیصلہ نہیں بدل ڈالتا یا جب تک میری موت واقع نہ ہو جاتی۔ اس کے ساتھ الجھ پڑنے سے میری نیت اس کی جان لینی نہیں تھی، اپنی جان دینی تھی —— لیکن تم نے اس پر خنجر چلا کر جام شہادت مجھ سے دور کر دیا۔ تمہارے غلط اقدام سے جنت کی مسافت میرے لئے طویل ہوگئی۔ تمہاری عجلت پسندی نے فیصلے کی میعاد بڑھا دی —— اب جام شہادت تک میرا ہاتھ دیر سے پہنچے گا۔ اور انتظار کا یہ وقفہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اپنے ساتھ خنجر لے کر چل رہے ہو تو تمہیں کبھی وہاں جانے کی اجازت نہیں دیتا"۔

عبداللہ ایک دم چونک اٹھا۔ "یہ کیا کہا؟ میرے ساتھ خنجر تھا؟ غلط! بالکل غلط!! یہ شکایت تو خود مجھے تم سے تھی۔ دار پر چڑھنے کیلئے تم سے زیادہ میں بے قرار ہوں۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ میرے لئے قیامت ہو رہا ہے۔ جو خیال تم نے اپنے متعلق ظاہر کیا ہے بس وہی خیال مجھے بھی یہاں لایا تھا۔ میرے پاس کوئی خنجر نہیں تھا۔ جان دینے والے کو جان لینا کہاں آتا ہے؟ جو خود جامِ شہادت نوش کرنا چاہتا ہو وہ وہی جام بھلا دوسروں کے سامنے کیسے بڑھا دے گا؟

امیر احمد نے عبداللہ کو گلے لگا لیا دونوں میں مصالحت ہوگئی اور اب دونوں پر یہ راز منکشف ہو گیا تھا کہ واردات قتل کے وقت فضا میں جو چمک پیدا ہوئی تھی وہ کیسی تھی؟

آخر فیصلہ کا دن آ ہی گیا۔ قانون کی نگاہ میں دونوں مجرم ثابت ہوئے اور دونوں ہی کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی گئی۔

آج شہر کی ساری آبادی علی پور جیل کے گرد سمٹ آئی تھی ہر کوئی اشکبار آنکھوں سے ان دونوں کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا، وہ چہرہ جن پر تقدس برس رہا تھا، معصومیت قربان ہو رہی تھی۔ تقدس برستا رہا، معصومیت ٹوٹتی رہی اور لوگ ان کا آخری دیدار کرتے رہے—— سارے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف تھیں، لیکن یہ دونوں کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بار بار ایک طرف اُٹھ اُٹھ جاتی تھیں۔ دفعۃً ان کے چہروں پر اضطراب کی ایک کیفیت نمودار ہوئی اور ان کا چہرہ اُتر گیا۔

ان دونوں کا آخری دیدار کرنے کیلئے ان دونوں کی مائیں بھی پشاور سے آ گئی تھیں اور اس وقت یہ دونوں بھی دیکھنے والوں کی صف میں کھڑی تھیں۔ جب انہوں نے ان دونوں کی اس حالت کا اندازہ کیا برس پڑیں۔

"دمِ آخر چہروں پر حزن وملال کے آثار کیوں؟ زندگی جب اتنی ہی پیاری تھی تو موت کو دعوت کیوں دی تھی؟ کیا اللہ والوں کا یہی وطیرہ ہے؟ شیدائیانِ رسول کا ایسا ہی کردار ہوتا ہے سرفروش اسی طرح جان دیتے ہیں——؟ خبردار! جو چہرے پر غم کی کیفیت پیدا ہونے دی۔ یاد رکھو! اگر تم نے ہنستے ہوئے جان نہیں دی، اگر دار ورسن کا پرتپاک خیر مقدم نہیں کیا، اگر مسکراتے ہوئے جامِ شہادت نہیں نوش کر سکے تو ہم تمہارا دودھ کبھی نہیں بخشیں گی۔ تم کو خوش ہونا چاہئے کہ آج تم اس سعادت سے بہرہ ور ہو رہے ہو۔ جو ہر کسی کا مقسوم نہیں ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا

امیر احمد اور عبداللہ ایک ساتھ بول اٹھے۔ "چہروں پر جو اضطراب کی لکیر آپ کو نظر آ رہی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم لوگ جان سے جا رہے ہیں، ہمارے چہروں پر غم کی گھٹا اس لئے نہیں چھائی ہے کہ ہم تختۂ دار پر چڑھنے ہی والے ہیں۔ ہماری پریشانیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ جامِ شہادت پیش کرنے میں لوگ دیر کیوں کر رہے ہیں؟ ہماری نگاہیں اس وقت جو کچھ دیکھ رہی ہیں اگر آپ دیکھ لیجئے تو آپ بھی ہماری جگہ آنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کے اطمینان کیلئے ہم اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہماری منزل مل گئی ہے۔

ہمارے آقا کالی کملی اوڑھے ہمارے سامنے کھڑے اپنے ہاتھوں کے اشارے سے اپنے پاس بلا رہے ہیں، لیکن ہمارے انکے درمیان شرط یہ ٹھہری ہے کہ ہم جامِ شہادت نوش کرنے کے بعد ہی اُن تک پہنچ سکیں گے۔

پھانسی کا پھندا آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ ہنستے ہوئے جان دے رہے تھے۔ انہوں نے جان دے ڈالی وہ دونوں شہید ہو گئے۔ رحمت کی گھٹائیں ان پر برس پڑیں اور وہ ان میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے۔

جنت کے جانے والے! جنت کا سفر مبارک ہو۔ اس کی سرمدی راحتیں مبارک ہوں، ابدی نعمتیں مبارک ہوں۔

ان شہیدانِ محبت کی آخری آرام گاہ ایک ہی ساتھ کلکتہ کے گوبرا قبرستان میں ہے، جہاں سے نامرادوں کو مرادیں ملتی ہیں اور محرومِ مسرّت شادمانیوں سے ہمکنار کیے جاتے ہیں۔

ضیاء جالوی

آستانہ رحمت سے گلشنِ جاناں تک

(1)

دل کے دروازے پر ہوش کا چراغ جلا دیا جائے، عقل کا پاسبان بٹھا دیا جائے، داخلے کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں، پوری ناکہ بندی کر دی جائے لیکن محبت وہ غنیم ہے کہ جب چڑھائی پر اُتر آئے تو چراغ بجھ جاتا ہے، پاسبان ہٹ جاتا ہے، راہ کی رکاوٹیں خیر مقدم کو کھڑی ہو جاتی ہیں اور ظالم آتی ہے تو خود سرانہ انداز میں آتی ہے۔ پیشانی پر غرور حاکمیت کا بَل ہوتا ہے۔ گیسوئے دراز میں برملا ساحری ہوتی ہے۔ بال بال سے خمار ٹپکتا ہے چشم زدن میں پوری کائنات مخمور ہو جاتی ہے! مسحور ہو جاتی ہے، جدھر اس کا اشارہ ہو، نگاہ ادھر جھکے جدھر اس کا حکم ہو دل ادھر اٹھے۔

یہی حال اس نوجوان کا بھی ہوا۔ محبت نے عقل و ہوش کو تاراج کر کے اس کے دل پر فرمانروائی شروع کر دی تھی۔ اس کا رنگ اڑنے لگا۔ مسکراہٹ جھلملانے لگی، غم کی لذت ایسی ملی کہ زندگی کے تمام ذائقے پھیکے پڑ گئے۔ وہ ہوتا اور یادِ حبیب ہوتی، رات ہوتی اور تصورِ جاناں ہوتا۔ چنگاری جب اپنی حقیر حیثیت میں نہ بجھائی جا سکی تو شعلہ پر اَب چڑھ جانے کے بعد کون بجھا سکتا ہے؟

وہ معمولاً ہر شام کو کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ جاتا۔ دُور دُور تک دیکھتا، اسے ایسا محسوس ہوتا کہ میدان کے حاشیہ پر عشق کا سبزہ پھیلتا جا رہا ہے۔ محبت کے پودے اُگ رہے ہیں۔ چراگاہوں سے اونٹوں کی قطاریں آتیں، بھیڑ بکریاں کے جھنڈ گذرتے۔ کبھی کبھی ریوڑ سے بھیڑیں منتشر ہو جاتیں، لیکن چرواہے کی آواز پر دوڑ پڑتیں۔ اونٹ بدک جاتے، لیکن ساربان کے اشارے پر سنبھل جاتے۔ وہ سوچتا، حیوانات میں پراگندگی ہونی چاہئے تھی،

لیکن وہ سمٹ رہے ہیں۔انسان کو سمٹنا چاہئے تھا،لیکن وہ بکھرتا جارہا ہے!! حالانکہ پروردگار عالم نے نظمِ انسانیت برقرار رکھنے کیلئے ہمیشہ اپنے ناظمان خصوصی کو بھیجا۔حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے۔آج بھی آخری ناظمِ اعلیٰ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہور فرما چکے ہیں۔تمام عالم میں اختیار وتصرف کا پورا حق مل چکا ہے۔زمین کا ہر ذرہ ان کے اشارۂ ابرو پر گردش کررہا ہے۔آسمان کا ہر سیارہ ان کی انگلی کی شہ پا کر چل رہا ہے۔سنتا ہوں کہ ان کی رفتارِ قدم سے خاک کے ذروں میں زندگی کا گداز پیدا ہوتا ہے۔ان کے خندۂ لب سے پتھروں میں شبنم کی نمی آجاتی ہے،ان کی تجلی نظر سے خس وخاشاک میں کہکشاں کا جمال مسکراتا ہے،ان کی بارگاہِ رحمت میں دلوں کے قافلے اور روحوں کے کاروان قطار اندر قطار پہنچتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔حد یہ ہے کہ مکے کے جن ظالموں نے رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہمیشہ پتھر پھینکے اور آپ کی ہر آسائشِ حیات چھین لی تھی۔بالآخر آپ نے انہیں ظالموں کو عفوودرگذر کے آبِ حیات سے نہلا دیا ہے۔مکہ نہیں فتح ہوا ہے مکے والے فتح ہوئے ہیں۔تعجب ہے کہ کمالات ومعجزات کے بار بار انکشاف کے باوجود ہنوز کچھ انسان گردابِ ضلالت میں پھنستے ہی چلے جارہے ہیں،خود میرے چچا کا حال یہ ہے کہ ان کی زندگی معصیت کے دلدل سے باہر نکلتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی ہے۔آخر میں کب تک سراب سے جی بہلاؤں؟ میری آرزو کی پیاس بڑھتی جارہی ہے۔میں آج چچا کو آخری فیصلہ پر مجبور کردوں گا۔میرا دل جدائی کی آگ میں جل رہا ہے۔میں جمال دوست کو سہارا بنانا چاہتا ہوں۔دیدار محبوب کے لئے ہر غم گوارہ کرنا چاہتا ہوں۔حضور سید عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آستانۂ رحمت پر اپنی زندگی کو نثار کردینا چاہتا ہوں۔

(2)

رات کا وقت تھا۔فطرتاً ہر جاندار آرام ڈھونڈھ رہا تھا۔حوصلہ مند نوجوان نے بھی اپنی جمعیت خاطر اور آرام جاں ڈھونڈنے کا تہیہ کرلیا۔نہایت مؤدبانہ انداز میں چچا کے قریب پہنچا اور بڑے عزم کے ساتھ کہا:" پیارے چچا! مجھے برسوں انتظار کرتے گذر گئے کہ کب آپ کے دل میں اسلام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور آپ کب مسلمان ہوتے ہیں لیکن آپ کا حال بدلتا

ہوا نہیں معلوم ہوتا اور میں اپنی زندگی پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتا ہوں۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسلام قبول کر لوں"۔ چچا نے بھتیجے کی بات سنی اور سر سے پاؤں تک غضب و ناراضگی میں ڈوب گیا۔ کافرانہ طنطنہ سے جواب دیا۔ "دیکھ تیرے بچپن ہی میں تیرا باپ مر گیا تھا۔ میں نے تیری پرورش کی۔ تجھے جوان کیا۔ اونٹ، بکریاں اور غلام دے کر تیری معاشی اور اقتصادی حیثیت درست کی ہے۔ اب اگر تو محمد کا دین قبول کرنا چاہتا ہے تو میں سب کچھ چھین لوں گا۔ تیرے بدن پر چادر اور تہہ بند تک باقی نہ رہنے دوں گا"۔

بھتیجے نے اسی استقبال سے جواب دیا۔ "چچا جان! میں نے اپنے جسم سے ہر جامۂ باطل اُتار دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں شرک و بُت پرستی سے بیزار ہو چکا ہوں، میں مسلمان ضرور بنوں گا۔ حضرت محمد ﷺ کی غلامی قبول کروں گا۔ اَب جو آپ کا منشا ہو، کیجئے اور میرے قبضہ میں جو زر و مال وغیرہ ہے سب لے لیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن ان سب چیزوں کو اسی دنیا میں چھوڑ جانا ہے۔ میں ان آسائشوں کی وجہ سے سچا دین نہیں چھوڑ سکتا ہوں"۔

عشق کے مارے نے یہ کہہ کر بدن کے کپڑے تک اُتار دیئے اور مادر زاد برہنہ ہو کر ماں کے پاس گیا۔ ماں دیکھ کر حیران ہو گئی کہ کیا ہوا؟ بیٹے نے بتایا کہ "میں مومن ہو گیا ہوں۔ اور اب حضور سیّد عالم (ﷺ) کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ ستر پوشی کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے مہربانی فرما کر مرحمت فرمایئے"۔

ماں نے ایک کمبل دے دیا۔ بیٹے نے کمبل پھاڑا۔ آدھے کا تہہ بند بنایا اور آدھا سر پر اوڑھ لیا اور رات ہی رات اپنے دیہات کی پہاڑیوں، ٹیلوں، میدانوں پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے مدینہ کی طرف چل پڑا۔ علی الصبح مسجد نبوی میں پہنچ گیا، اور منبر سے ٹیک لگا کر دیدار محبوب کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بھی نہیں گذری تھی کہ حجرۂ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا دروازہ کھلا اور کالی کملی والے آقا اپنی شان دلربائی کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے۔ ارشاد فرمایا: "تم کون ہو؟" مسافر نے جواب دیا: "میرا نام عبدالعزیٰ ہے۔ فقیر و مسکین ہوں۔ آپ کے دامنِ کریم کی پناہ میں حاضر ہوا ہوں"۔

رحمت عالم ﷺ نے مسکرا کر فرمایا ——— ''تمہارا نام عبداللہ ہے ذوالبجادین تمہارا لقب ہے تم ہمارے قریب ہی ٹھہرو اور مسجد میں رہا کرو''۔

جناب عبداللہ صحاب صفہ میں شامل ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ سے قرآن پاک سیکھتے اور پورے جوش کے ساتھ پڑھا کرتے۔

(3)

رجب ۹ ھ کا زمانہ تھا۔ عرب کی مشہور گرمی اپنے شباب پر تھی۔ مدینے میں میرے پک گئے تھے۔ میوے کھانے اور درختوں کے سایے میں بیٹھنے کا دن آ گیا تھا۔ ناگاہ سر زمین شام سے ایک قافلہ نے آ کر بتلایا کہ قیصر کی فوجیں مدینے پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ عرب کے عیسائی قبائل جزام، عاملہ، غسان وغیرہ بھی ان کے ساتھ شامل ہیں ——— رحمت عالم ﷺ نے خیال فرمایا کہ غنیم کی مدافعت عرب کی سرزمین میں داخل ہونے سے پہلے پہلے مناسب ہے۔ تاکہ داخلی امن میں رخنہ نہ واقع ہو۔ لیکن ایسی سلطنت سے مقابلہ تھا جس کی مادی طاقتیں شہرت یافتہ تھیں اور جس نے ماضی قریب میں ایرانی محاذ جنگ کو شکست دے دی تھی تقریباً یہ سلطنت نصف دنیا پر حکمراں تھی۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے عزم سفر کیلئے عام چندے کا مطالبہ فرمایا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نوسو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار چندہ میں لے کر حاضر ہوئے ان کو ''مجهز جيش العره'' کا خطاب ملا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم پیش کیے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تمام اثاث البیت کا نصف حصہ لے کر حاضر ہوئے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر میں اللہ اور رسول کی محبت کے سوا باقی جو کچھ تھا، مسجد نبوی میں پہنچا دیا۔ الغرض اس موقعہ پر ہر صحابی نے، اپنے جوش یقین اور خلوص عمل کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اصحاب صفہ کا وہ نادار طالب علم جس کی رگ رگ میں عشق رسالت پناہی سما چکا تھا، جہادِ اسلامی کے یہ روح پرور مناظر اور جانبازان نبوت کی بے لوث فداکاریاں دیکھ کر بیخود ہو گیا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور بھیگی ہوئی پلکوں کے ساتھ بارگاہ نبوت میں حاضری دی اور سلام کے بعد عرض کیا۔

''یا رسول اللہ! میں غریب ہوں۔ میرے پاس درہم و دینار نہیں ہیں کہ غزوہ تبوک کی

تیاری میں رضا کارانِ اسلام کی طرح پیش کروں۔ لیکن چندہ میں کچھ نہ کچھ لے کر میں حاضر ہوا ہوں۔ یا رسول اللہ! آپ کے قدموں پر اپنا دل وجگر اور آپ کی ٹھوکروں میں اپنا سر پیش کر رہا ہوں۔ قبول کیجئے اور دعا فرمایئے کہ میں بھی راہِ خدا میں شہید ہو جاؤں"۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جاؤ! کسی درخت کا چھلکا اتار لاؤ" ——— جب عبداللہ رضی اللہ عنہ چھلکا لے آئے تو حضور نے وہ چھلکا ان کے بازو پر باندھ دیا۔ اور زبان مبارک سے فرمایا: "الٰہی میں کفار پر ان کا خون حرام کرتا ہوں"۔

عبداللہ نے کہا: "یا رسول اللہ! میں تو شہادت کا طالب ہوں"۔ غیب داں نبی ﷺ نے فرمایا: "جب غزا کی نیت سے تم نکلو اور پھر تپ آ جائے اور مر جاؤ تب بھی تم شہید ہی ہو گے"۔

(4)

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تیس ہزار کی جمعیت لے کر تبوک کو روانہ ہوئے۔ مدینہ میں سباغ بن عرفطہ کو خلیفہ بنایا اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اہلبیت کی ضروریات کیلئے مامور فرمایا۔ لشکر میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ مجاہدوں کیلئے ایک اُونٹ مقرر تھا۔ رسد کے نہ ہونے کی وجہ سے اکثر جگہ درختوں کے پتے کھانے پڑے جس سے ہونٹ سوج گئے تھے۔ بعض جگہ پانی ملا ہی نہیں۔ تبوک پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ قیام فرمایا۔ اہل شام کے دل رسالت پناہی کے دبدبے سے دہل اُٹھے، اور دیارِ عرب پر حملہ آوروں کا خیال منسوخ کر دیا۔

حضرت رسول مقبول ﷺ نے مدینے میں ایک ماہ قبل مستقبل سے متعلق جو پیش گوئی کی تھی حرف بحرف پوری ہوئی۔

تبوک پہنچ کر جناب عبداللہ کو تپ چڑھی اور عالم بقا کو سدھار گئے۔ بلال بن حارث مزنی نے عبداللہ کے دفن کی چشم دید واردات بیان کی ہے۔

"رات کا وقت تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں چراغ تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ کی لاش کو لحد میں رکھ رہے تھے۔ رحمت عالم ﷺ بھی ان کی قبر میں اترے ہوئے تھے اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے فرما رہے تھے۔ "اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو"۔

آنحضرت ﷺ نے قبر پر اینٹیں بھی اپنے ہاتھ سے رکھیں اور دُعا میں فرمایا: ———

''الٰہی! آج کی شام تک میں اس سے راضی رہا ہوں۔تو بھی اس سے راضی ہو جا''۔

اللہ اللہ کیا وقت تھا کہ ایک مرحوم کو رحمت، رحمٰن کے حوالے کر رہی تھی۔حضرت مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ــــــ ''کاش! اس قبر میں میں دفنایا جاتا؟''

میرا خیال ہے کہ اس موقعہ پر ہر صحابی کے دل میں احساس تھا:

''یہی موت مرنے کو جی چاہتا ہے''۔

مولانا ابوالوفا صاحب فصیحی غازی پوری

زبیدہ خاتون

دنیائے اسلام کا مایہ ناز فرماں روا خلیفہ ہارون رشید بغدادی جس کے رعب وجلال سے دنیا کے تین حصے ہمیشہ متاثر رہے۔ فارس، روم اور یورپ کے سلاطین جس کی چوکھٹ کے باجگذار کہلاتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔

زبیدہ خاتون اسی نیک نام بادشاہ کی پاک طینت وفا سرشت اور فیاض بیوی تھی۔ ویسے کہنے کیلئے وہ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ تھی۔ لیکن اس کے پہلو میں نہایت مسکین، پرسوز اور دردمند دل تھا۔

اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگوں سے وہ بے پناہ عقیدت رکھتی تھی۔ مقدس مقامات کی زیارت اور مزارات طیبات کی حاضری اس کی زندگی کے محبوب ترین معاملات میں سے تھے۔

مکہ معظمہ میں "نہرِ زبیدہ" نام کا صاف وشیریں چشمہ اس کے جذبہ عقیدت کی یادگار ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ بغداد میں ہر طرف سلطان العاشقین حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کے عشق وسرمستی اور جذب واستغراق کا ڈنکا بج رہا تھا ایک دیوانۂ عشق کے پیچھے پیچھے کھنڈروں اور صحراؤں میں پروانوں کا ہجوم سیلاب کی طرح رواں دواں رہا کرتا تھا جہاں بیٹھ گئے دنیا بس گئی، اُٹھے تو شہر اُجڑ گیا۔

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو اب ڈھونڈیئے ان کو چراغ رُخ زیبا لے کر اور کہیں مل گئے تو عالم ایسا کہ ملنا نہ ملنا دونوں برابر، ہزاروں کے بیچ لیکن تنہا، خیال یار کے سوا کوئی شریک جہاں نہیں دل کی دھڑکنوں سے قریب لیکن دُور بہت دُور سرحد امکان کے اس پار، قدم قدم پر عشق بے نیاز کا جلوہ، ادا ادا میں شان استغنا کا ظہور اسی عالم کیف ومستی کے ساتھ حضرت بہلول دانا دل کی ہزاروں بستیوں میں اُتر گئے تھے۔

زبیدہ خاتون بھی ان کے کشف و کرامات اور جذب و عشق کے غلغلوں سے بے حد متاثر تھی۔

زیارت کا شوق دبی ہوئی چنگاری کی طرح ہمیشہ سلگتا رہتا تھا۔ ہزار موقع تلاش کرنے پر بھی دل کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا۔ تخت و تاج کی ملکہ سے کسی دیوانۂ عشق کا رشتہ ہی کیا ہو سکتا ہے اپنے محبوب حقیقی کیلئے جس نے دونوں جہان سے منہ پھیر لیا ہو وہ کسی اور کو کیوں دیکھے اور پھر جنون شوق کے ہاتھوں جسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہو اس کی بے التفاتیوں کا شکوہ ہی کیا ہے؟

البتہ طبیعت کبھی نشاط پر ہو، وحشت عشق کا طوفان بھی تھم گیا ہو۔ اور جہان خاکی کی طرف توجہ مبذول کرنے کی فرصت بھی مل گئی ہو تو کچھ عجیب نہیں کہ اپنے کسی پروانہ کی طرف نگاہ اٹھ جائے اور اسے کونین کی فیروزمندیوں سے سرفراز کر دیا جائے۔

ایک بار زبیدہ خاتون کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا اور وہ نہال ہو گئی۔

(2)

چار بجے شام کا وقت تھا دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنے مستقر کی طرف تیزی سے لوٹ رہا تھا۔ ہوا کی خنکی اور فضا کی رعنائی خوش گوار ہوتی جا رہی تھی یہی وقت تھا کہ جب زبیدہ خاتون تفریح کیلئے شاہی باغ میں جایا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کنیز نے آکر اطلاع دی "حضور! ملکہ معظمہ سواری تیار ہے خواصیں خیر مقدم کیلئے چشم براہ ہیں"۔

زبیدہ خاتون کنیزوں کے جھرمٹ میں اٹھی اور سواری میں آکر بیٹھ گئی۔

سواری محل کے دروازے سے نکل کر بغداد کی محفوظ شاہراہوں سے ہوتی قریب ہی ایک شاداب صحرا کی طرف بڑھنے لگی تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک وادی کے نشیب سے گذرتے ہوئے اچانک ایک کنیز کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔

ملکہ وہ دیکھئے! حضرت بہلول دانا جھاڑیوں کے درمیان کچھ چن رہے ہیں۔ زبیدہ چونک گئی۔ خوشی سے دل اچھلنے لگا۔ محافے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو بکھرے ہوئے بال پراگندہ

پراہن اور حیرت زدہ چہرے کے ساتھ ایک شخص پتھر کے ٹکڑوں کو جمع کر کے کچھ بنا رہا تھا۔ سواری روک دی گئی۔ اضطرابِ شوق کے عالم میں زبیدہ اُتر پڑی اور لرزتے کانپتے جھجکتے ڈرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔

ہمّت کر کے سامنے پہونچی اور مؤدّب کھڑی ہوگئی۔ حضرت بہلول دانا پتھروں کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انہوں نے آنے والی کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں فرمائی۔

ایک گم گشتہ حال دیوانۂ عشق کا نظارۂ جمالِ یار سے اتنی کہاں فرصت کہ نگاہ اٹھا کر کسی اور کو دیکھتا۔

بادشاہِ وقت کی ملکہ جس کے سامنے کھڑی تھی وہ خود ہفت اقلیم کا بادشاہ تھا۔ اس کی ابرو کی شکن پر بادشاہتوں کی تقدیر ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی اِس کی حکومت کا رقبہ جہان فانی سے لے کر عالم جاوید تک پھیلا ہوا تھا۔

زبیدہ امید وبیم کے عالم میں دیر تک سر جھکائے کھڑی رہی خود ہی ہمت کر کے نہایت اَدب کے ساتھ عرض کیا:

السلامُ علیکم!

یہ الفاظ شہنشاہِ کونین، خاتم پیغمبراں کی شریعت طاہرہ کے تھے سنّت رسول کے احترام میں دیوانہ اپنے عالم سے پلٹ آیا۔ جبروت عشق کی شراب ناب سے مخمور آنکھیں اوپر اٹھیں اور دل کا کشور جیت لینے والی آواز میں جواب دیا:

وعلیکم السلام!

لب ولہجہ کے جلال سے فضا لرز گئی۔ زبیدہ کا نرم و نازک دل کانپ گیا۔ کچھ وقفے کے بعد ہمّت بندھی حوصلہ بڑھا اور امید ہوگئی کہ آج ساقی مائل بہ کرم ہے دوبارہ عرض کیا:

''حضور یہ کیا بنا رہے ہیں؟''

کونین کے راز دار سے یہ سوال کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ ہزار غیر اہم ہونے کے

باوجود بھی سلطنت کے رموز بتانے کے نہیں ہوتے۔ اقلیم باطن کا سلطان کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے، اس کی شام وسحر کہاں بسر ہوتی ہے یہ سرتاسر کائنات عشق کے اسرار ہیں محرم راز کے سوا انہیں کوئی نہیں جان سکتا۔

زبیدہ خاتون کا سوال بھی بالکل اسی طرح تھا۔ وہ ایک دیوانۂ عشق سے عالم حقیقت کا راز فاش کرانا چاہتی تھی جس کا سلسلہ عالم امر سے ہے۔

اس مصلحت نا آشنا سوال پر حضرت بہلول دانا کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ پیشانی کی سطح خاموش پر شکن اُبھر آئی۔

یہ کیفیت دیکھ کر زبیدہ دہشت زدہ ہوگئی لیکن سوال کے پیچھے اسے اپنے دل کے اخلاص وعقیدت کا یقین تھا اِس لئے نتائج کی طرف سے وہ بالکل مطمئن تھی۔

پھر اچانک ایسا ہوا چہرے کا تیور بدل گیا۔ پیشانی کی شکن مٹ گئی۔ لالہ کے ورق پر شبنم کی نمی ابھر آئی کرم کا چشمہ پھوٹ پڑا اور حضرت بہلول دانا نے حقیقت کے چہرے سے نقاب اُلٹتے ہوئے فرمایا:۔۔۔۔ "کیا بنا رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنا چاہتی ہے تو یقین کے کان سے سن لے کہ میں فرش گیتی پر جنت کا محل بنا رہا ہوں"۔

"ایمان اور عقیدت کی سلامتی اور فیضان عشق کی برتری بھی کیا چیز ہوتی ہے"۔

عقل فتنہ پرداز جسے دن کی طرح روشن حقیقتوں کا انکار کرتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی۔ یہاں پہنچ کر اس کی رہبری کا چراغ گل ہوجاتا ہے۔

عقل فریب کار کے مشورے پر دانشوروں کا قافلہ اپنی راہ بدل دیتا ہے لیکن ہزار افسوس کے بعد دیوانہ جادۂ حق سے کبھی نہیں ہٹتا عقیدت وعشق سرحد یقین جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں عقل درماندہ شام کا چراغ جلاتی ہے۔ بحث ودلیل سے بے نیاز اس نئے اقلیم میں داخلے کا پروانہ اسے آج تک نہیں مل سکا۔۔۔۔ زبیدہ خاتون کو یہ یقین کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ اینٹ اور پتھر کا یہ گھروندا یقیناً فرش گیتی پر جنت کا محل ہے۔ اپنی آنکھ کا دیکھا غلط ہوسکتا ہے لیکن ایک عارف عشق کی بات کبھی نہیں غلط ہوسکتی۔

اس یقین کے نتیجے میں پھر اس نے سوال کیا۔۔۔۔ "حضور! جنت کا یہ محل میرے

ہاتھ پر فروخت کریں گے؟"

جواب ملا ——— "ضرور فروخت کروں گا۔"

ذرا نازِ بندگی کا تماشہ دیکھئے جنت کس کی اور فروخت کون کر رہا ہے۔ سچ فرمایا ہے جانِ عاشقاں ﷺ نے کہ "جو خدا کا ہوتا ہے خدا اس کا ہوتا ہے۔"

اب اس تشریح کی چنداں حاجت نہیں ہے کہ جب خدا ہی اس کا ہو گیا تو اب کائنات میں باقی کیا رہ گیا۔ دشوار کونین کی تسخیر کا مرحلہ نہیں ہے۔ دراصل سب سے مشکل کام خدا کو راضی کرنا ہے۔ خدا کے محبوب مطلق ﷺ کی خوشنودی کا حصول ہے۔ بادشاہ کے تئیں مقرب و معزز ہو جانے کے بعد رعایا کی تسخیر کا سوال ہی نہیں اٹھتا ——— اس جواب پر زبیدہ خاتون کی روح جھوم اٹھی۔ اس نے پُر اُمید لہجے میں پھر دریافت کیا ——— "کتنی قیمت پر فروخت کریں گے یہ جنت"۔

جواب دیا ——— "ایک درہم پر"

ذرا رحمت یزدانی کی یہ ادا تو دیکھئے۔

براہ راست خریدو تو جنت کی قیمت پوری جان۔ اجنبی سے لینا چاہو تو ایک درہم۔ میدانِ جہاد کے شہیدوں کا حل یہ ہے کہ ایک بار جان دی۔ ایک جنت کے مستحق ہو گئے۔ لیکن جو ہر آن خنجرِ تسلیم و رضا سے شہید ہو ہو کر مرتا اور جیتا ہے اور پھر شہید ہوتا ہے، ہر شہادت پر ان کشتگانِ عشق کو جو جنتیں ملتی ہیں انہیں اختیار ہے یونہی دیدیں قیمت لگائیں بخشی ہوئی جنت کو جو چاہیں سو کریں۔ اپنی چیز اپنی مرضی۔

جواب سنتے ہی زبیدہ نے فوراً قیمت پیش کر دی۔ قیمت ادا ہو جانے کے بعد حضرت بہلول دانا نے ایک لکڑی اٹھائی اور ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے فرمایا۔

"میں نے جنت کا یہ محل ایک درہم کے عوض زبیدہ خاتون کے ہاتھ بیچ دیا ———"

یہ سنتے ہی زبیدہ خاتون اس یقین کی خوشی میں سرشار ہو گئی۔ کہ اسے جیتے جی جنت مل گئی۔ زمین خدمت چوم کر جب وہ اپنی سواری کی طرف واپس لوٹ رہی تھی تو اپنے نصیبے کی ارجمندی پر اس طرح نازاں تھی جیسے دنیا میں اب اس کا کوئی مدِمقابل نہیں ہے۔

آج میکدۂ عشق کے ایک بادہ نوش نے اس کی آفرینش کا سب سے نازک ترین مرحلہ طے کر دیا تھا۔ مرنے کے بعد اپنا انجام وہ خود بیان کر دینے کے قابل ہو گئی تھی۔ اسے نا معلوم طور پر یقین تھا کہ موت کی آخری ہچکی تک جنت کا استحقاق باقی رہے گا۔

فضا میں شام کی سیاہی پھیل گئی تھی لیکن وہ فیروز بختی کے اجالے میں شاہی محل واپس ہوئی۔

(3)

غالباً رات کا پچھلا پہر تھا۔ سارے محل پر رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دُور کہیں کہیں سے پاسبانوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بغداد کا حسین و دلکش شہر دُھلی ہوئی چاندنی میں نہا نہا کر اور نکھر گیا تھا۔ جا بجا کشور ولایت کے سلاطین کی خوابگاہوں سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں زمین سے آسماں تک ساری فضا تجلیات کے انوار سے جگمگا رہی تھی۔

نماز تہجد اور مناجات نیم شبی سے فارغ ہو کر زبیدہ خاتون اپنے حرم سرا میں محو خواب تھی۔ دروازے کے باہر کنیزان خصوصی کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ اچانک قدموں کی آہٹ پر ایک کنیز چونک گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو بادشاہ وقت ہارون رشید دبے پاؤں چلے آرہے تھے۔ خلافت عادت تشریف آوری پر کنیزیں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں ——— ہارون رشید نے آگے بڑھ کر زبیدہ کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔ زبیدہ کی آنکھ کھل گئی۔ رات کے سناٹے میں دروازے پر دستک زندگی کا غیر معمولی حادثہ تھا۔

گھبرائی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھولا۔

ہارون رشید کو دروازے پر دیکھ کر کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ سکتے کی حالت میں اس نے بادشاہ کا خیر مقدم کیا اور اندر لے آئی۔

طرح طرح کے اندیشوں سے جگر کا خون سوکھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل سکے: ———

''اتنی رات گئے قدم رنجہ فرمانے کی وجہ نصیب دشمناں کوئی تشویشناک حادثہ تو نہیں ہے خدارا جلد فرمایئے دل ڈوب رہا ہے۔''

ہارون رشید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ——— ''کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔

بلکہ ہر طرف مولائے کریم کا فضل شریک حال ہے۔ امورِ مملکت بھی قابل شکر ہیں۔ میری بے وقت کی آمد کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے۔ اطمینان رکھو۔

یہ جواب سن کر زبیدہ کا اضطراب کچھ ہلکا ضرور ہو گیا۔ لیکن قدم رنجہ فرمانے کی وجہ اب تک صیغۂ راز میں رہی۔ اس نے پھر دریافت کیا:——

"لیکن اتنی رات اچانک امیر المومنین کی تشریف آوری بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔"

ہارون رشید نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا—— "تمہارا اضطراب حق بجانب ہے تم اپنی گھبراہٹ پر قابو پالو تو میں وجہ بتاؤں۔ دراصل ایک خوش آیند واقعہ کی صرف تم سے تشریح کرانے آیا ہوں۔

ابھی ابھی نماز تہجد سے فارغ ہونے کے بعد ذرا دیر کے لئے میری آنکھ لگ گئی۔ اتنے ہی وقفے میں میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیا کہ میں ایک نہایت حسین ودلکش چمن کی سیر کر رہا ہوں۔ پھولوں کی رعنائی، بہاروں کی نکہت اور درختوں کی زیبائی دیکھ کر حیران ہوں، ہموار زمین شفاف آئینے کی طرح دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں ہر طرف نرم ونازک ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے خوش رنگ پرندوں کے نغمے جادو جگا رہے ہیں۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا سلسلہ حدِ نظر سے بھی آگے ہے۔

حیرانی کے عالم میں سیر کرتا ہوا کچھ اور آگے بڑھا تو رنگ ونور میں ڈوبے ہوئے اونچے اونچے محلوں کی قطار شروع ہو گئی۔ لعل وزمرد اور یاقوت وزبرجد کے بنے ہوئے ایوان نگاہوں کی خیرہ کر رہے تھے میں عالم حیرت میں ڈوبا ہوا نہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے قریب سے جھلملاتا ہوا نورا ایک پیکر لطیف گزرا۔ اس کے نشان قدم سے روشنی پھوٹ رہی تھی، چہرے کی تابندگی سے گزرگاہوں میں اجالا پھیل رہا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی ہو نہ ہو یہ کوئی فرشتہ ہے۔

آگے بڑھ کر میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بہت سے تیزی سے وہ یہ کہتے ہوئے آگے گزر گیا۔ "جنت الفردوس۔"

جواب سن کر میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا اپنے نصیبے کی ارجمندی پر ناز کرتا جوں ہی آگے بڑھا سامنے بلند قامت دروازے کی پیشانی پر نظر پڑی، اس پر بخط سبز لکھا ہوا تھا "زبیدہ

خاتون'' یہ تحریر پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دروازے کے اندر داخل ہوا تو جس عمارت پر بھی نظر پڑی ——''زبیدہ خاتون'' کا سرنامہ جھلک رہا تھا۔

دیر تک کھڑا سوچتا رہا کہ زبیدہ خاتون میری محبوب ملکہ کا نام ہے۔ ہوسکتا ہے کہیں آس ہی پاس میرا نام کندہ ہو۔ اِسی آرزو کے شوق میں میلوں دور تک نکل گیا۔ لیکن ہر جگہ زبیدہ خاتون کا نام نظر آیا —— خواب سے بیدار ہونے کے بعد تعبیر کے تجسس نے مجھے اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ میں صبح ہونے کا انتظار کرتا۔

زبیدہ خاتون سے مراد اگر تمہاری ہی ذات ہے تو یقیناً تم قابل رشک ہو۔ خلاف مصلحت نہ ہو تو اپنی زندگی کا وہ راز بتادو جس نے جیتے جی تمہارا نام باغ فردوس تک پہنچا دیا ہے۔

زبیدہ خاتون کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ اس نے نظر نیچی کئے ہوئے جواب دیا مجھے اپنے نامۂ زندگی کا کوئی ایسا عمل نہیں یاد آرہا ہے جسے خدا کی اس عظیم الشان نعمت کا اجر قرار دوں۔

البتہ آج شام کو اچانک اپنے وقت کے مشہور مجذوب حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت نصیب ہوگئی تھی۔ وہ ایک ویرانے میں اینٹ اور پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنا رہے تھے کچھ دیر انہیں مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ان سے دریافت کیا۔ اے بہلول یہ آپ کیا بنارہے ہیں؟ جواب دیا جنت کا محل —— پھر پوچھا بیچئے گا؟ جواب دیا ضرور بیچوں گا۔ اس کے بعد میں نے ایک درہم ان کی منہ مانگی قیمت ادا کی۔ انہوں نے ایک گھروندے کے گرد خط کھینچتے ہوئے کہا —— جنت کا یہ محل میں نے زبیدہ خاتون کے ہاتھ پر بیچ دیا۔

ہارون رشید یہ سن کر بھڑک اٹھا اور جوش عقیدت میں بول اٹھا: ——

''یقیناً یہ انہیں کی زبان کی برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی بات کبھی رائیگاں نہیں کرتا۔ روئے زمین پر مقدس ہستیاں خدا کی شان رحمت ہی کا پرتو ہیں۔ ان کی پیشانی کی موجوں میں صفات حق کا عکس نظر آتا ہے۔ کارکنان قضاوقدر ان کی زبانوں پر چلا کرتے ہیں —— خلافتِ الٰہی کے منصب نے انہیں کونین کا فرماں روا بنادیا ہے۔ بلا وجہ

امتِ محمدی ان کے پیچھے نہیں دوڑتی۔"

یہ کہتے کہتے ہارون رشید کا لہجہ بدل گیا۔ آواز بھر گئی اور اس نے گزارش والتجا کے انداز میں کہا ـــــ "تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک دن مجھے ان کی سرکار میں لے چلو نصیبے کی کامرانی نے ساتھ دیا تو میں بھی جنت کا حقدار بن جاؤں۔"

زبیدہ نے پرتپاک انداز میں جواب دیا ـــــ "ضرور چلئے جنت میں آپ کی رفاقت کا اعزار حاصل کر کے میرے دل کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔"

(4)

صبح کا سہانا وقت تھا۔ رات ہی سارے محل میں یہ خبر گرم تھی۔ کہ بادشاہ ملکہ کے ہمراہ سیروسیاحت کیلئے تشریف لے جائیں گے۔ طلوع آفتاب سے پہلے پہلے دونوں اپنے مقدس سفر پر روانہ ہو گئے۔ حضرت بہلول دانا رحمۃ اللہ علیہ کی تلاش کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کا ملِ جانا حسنِ اتفاق کا کرشمہ کہا جا سکتا تھا۔ سارا دن ویرانوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے لیکن کہیں ان کا سراغ نہیں لگ سکا۔ تھکے ماندے شام کو محل واپس لوٹ آئے۔ پھر ایک دو روز کے وقفہ کے بعد ان کی تلاش میں نکلے اور دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ناکام واپس آئے۔

اس طرح لگاتار کئی دن کی ناکامیوں کے بعد ایک دن پہاڑ کے دامن میں حضرت بہلول دانا مل گئے ـــــ آج بھی ان کا وہی عالم تھا آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور دونوں جہان سے بے نیاز پتھر کے ٹکڑے جمع کر کے گھروندے بنانے میں منہمک تھے۔

زبیدہ خاتون نے دور سے اشارہ کیا۔ نظر پڑتے ہی ہارون رشید پر لرزہ طاری ہو گیا، قدم اٹھانا مشکل تھا۔ آگے بڑھنے کی ہمت جواب دے گئی۔

اللہ اللہ! ساری دنیا جس کے دربار کی جلالت شان سے لرزہ براندام رہا کرتی۔ آج ایک بے سروسامان درویش کے سامنے خود اس پر لرزہ طاری تھا۔ ایک ہارون رشید ہی کیا، خاکدان گیتی کے کسی تاجدار کا یارا ہے کہ ہیبت حق کے آگے سر اٹھا سکے؟

زبیدہ خاتون نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ذرا بھی مت گھبرایئے۔ یہ جلالت عشق کی ہیبت ہے جس کی تپش سے کائنات کی نبض چل رہی ہے اس کی سطوت کے سامنے پہاڑوں

کی فلک نما چوٹیاں بھی سرنگوں ہیں آپ بغیر کسی اندیشے کے ایک نیاز مند سائل کی طرح ان کے آگے کھڑے ہو جایئے۔ وہ اس وقت کسی اور عالم میں، سلام کی آواز سن کر آپ کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

اس کے بعد آپ ان سے دریافت کرنا کیا کر رہے ہیں وہ جواب میں جنت کا محل ضرور کہیں گے۔ پھر خرید و فروخت کی بات کیجئے۔ وہ اثبات میں جواب دیں گے۔ پھر جو قیمت بتائیں ادا کر دیجئے۔ اسی طرح میرے ساتھ معاملہ ہوا تھا۔

لرزتے کانپتے ہوئے ہارون رشید آگے بڑھے اور ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

عشق کی دولتِ اقبال کا یہ بھی عجیب و غریب منظر تھا۔ کہ دنیا کا سب سے بڑا فرماں روا آج ایک فقیر کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا عالم محسوس میں یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی تھی۔ کہ عشق ہی کائنات کا اصل فرماں روا ہے۔ جاہ و حشمت کا چڑھتا ہوا سورج ہر جگہ سر اٹھا سکتا ہے لیکن مستانِ عشق کی چوکھٹ پر پہنچ کر وہ سرنگوں ہو جاتا ہے —— تھوڑی دیر کے بعد ہارون رشید نے نہایت ادب کے ساتھ سلام عرض کیا۔

جواب ملا۔ وعلیکم اسلام

پھر دریافت کیا —— ''اسے فروخت کیجئے گا؟''

جواب ملا —— ''ضرور۔''

قیمت دریافت کی، تو یہ سن کر پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

''تیری پوری سلطنت جنت کی قیمت ہے۔''

دیر تک سکتے کا عالم طاری رہا۔ کچھ وقفے کے بعد پھر عرض کیا: ——

''حضور ابھی چند ہی دنوں کی بات ہے کہ حضور کی کنیز زبیدہ خاتون بارگاہ میں حاضر ہوئی تھی۔ آپ نے ایک درہم پر اس کے ہاتھ پر جنت فروخت کی ہے۔ یک بیک قیمت کی سطح اتنی اونچی ہو گئی۔ کہ وہم و گمان سے باہر۔

حضرت بہلول رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پُر اسرار دانشور کے انداز میں جواب دیا: ——

''زبیدہ خاتون پر اپنا قیاس مت کرو، وہ جنت دیکھ کر نہیں آئی تھی اس نے صرف میری

زبان پر ان دیکھی جنت کا یقین کرلیا۔ اینٹ اور پتھر کے گھروندے کو جنت کا محل سمجھنے کے لئے اسے اپنے مشاہدے کا انکار کرنا پڑا، نظر کے فیصلے سے جنگ کرنا پڑی، عقل کی دریافت کو جھٹلانا پڑا۔ اور جرأت عشق کے یہ سارے مرحلے اس نے ایک آن میں طے کر لیے۔

اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم جنت دیکھ کر آرہے ہو۔ بہاروں کا وہ صبح خندان اور جگمگاتے ہوئے محلوں کا وہ جمال اب تک تمہاری نظر کے سامنے ہے۔ اس لئے تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جاسکتی۔

یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لو کہ دراصل جنت کی قیمت درہم و دینار نہیں ہے۔ دل کا ان دیکھا اور روح کا نادیدہ اعتماد ہے۔

عالم آخرت کی ساری فیروز بختی تو ایمان بالغیب ہی کی ہے۔ نہ دیکھو اور یقین کرو، نہ سنو اور ایمان لاؤ، یہی تو اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔

حرم کی دیواریں نہ بھی نظر آتی جب بھی اس کا احترام بجالانا ہر مومن کا شیوۂ دین ہے۔ کونین کے آقا سرکار مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آج ماتھے کی آنکھوں کے سامنے جلوہ فرما نہیں ہیں۔ لیکن اہل دل سے پوچھ کہ خطہ ارضی کے چپے چپے پر آج بھی ان کے قدم ناز کے لئے نگاہوں کا فرش بچھا رہتا ہے۔"

سر جھکائے ہوئے ہارون رشید سنتا جا رہا تھا۔ اور چہرے کی رنگت، دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کا راز فاش کر رہی تھی۔ اچانک آنسوؤں سے پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ دل کی آنکھوں کے پٹ کھل گئے، آخرت کا یقین سورج کی طرح چمکنے لگا۔ اور چند روزہ وجاہت و سلطنت کا سارا خمار اتر گیا۔ بے خودی کے عالم میں گھٹنے ٹیک دیئے اور لجاجت کے ساتھ عرض کیا:——

"حضور: سلطنت دے کر قیمت چکانے کیلئے تیار ہوں، جنت کا پروانہ عنایت فرما دیا جائے"۔

عجز و درماندگی کی اس التجا پر حضرت بہلول دانا کا دل مہر و شفقت کے گداز سے بھر گیا۔ آپ نے اسی عالم میں جواب مرحمت فرمایا:——

"جذب و سرمستی کے کیفِ دوام نے مجھے دونوں جہاں کی لذتوں سے بے نیاز کر دیا

ہے۔ میں تیری سلطنت لے کر کیا کروں گا۔ دل تو بڑی چیز ہے سلطنت کے لئے تو میری ٹھوکروں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ جا: اپنی سلطنت بھی لے جا اور جنت کا یہ پروانہ بھی رکھ لے۔

درویش کا مقصد دل کو حرص و ہوس کی زنجیروں سے آزاد کرانا تھا۔ ایک درہم اور پوری سلطنت دونوں کے درمیان اس کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے دل کے یقین اور عقیدت کے اخلاق کا ہے۔"

ہارون رشید جب خلعت جاوید سے سرفراز ہو کر واپس ہوا تو زبیدہ خاتون نے دریافت کیا——"میں حیران ہوں کہ آپ کو جنت کے حصول پر مبارکباد دوں یا دل کے نئے عالم پر؟"

ہارون رشید نے جواب دیا:——

"والی کشور عشق کی سرکار سے دل کو جو نیا عالم عطا ہوا ہے۔ دراصل عالم آخرت کے سارے اعزاز کی کلید یہی ہے؟

علامہ ارشد القادری

ادائے رحمت

زندگی سوزِ محبت سے سنورتی ہے ادیب
غم سلامت ہے تو مٹی مری برباد نہیں

رات خوفناک حد تک سیاہ تھی اور فضائے عالم پر مکمل سکوت طاری تھا۔ رات کے سناٹے میں ایک بندہ خدا کمال جذبۂ عبودیت کے ساتھ سربسجود تھا اس نے سجدے سے سر اٹھایا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے:

"میرے معبود! میری سینکڑوں راتیں تیری بارگاہ بے نیاز میں عرض نیاز کرتے گزر گئیں۔ لیکن آج تک میری وہ ایک آرزو بھی پوری نہ ہو سکی جس کے لئے اب تک سینکڑوں آرزوؤں کا خون کر چکا ہوں۔ کعبۂ مقصود تک پہنچنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ منزل مراد کی تلاش مجھے کہاں کہاں نہ لے گئی۔ لیکن آج تک نہ منزل مراد کا سراغ مل سکا نہ کعبۂ مقصود تک رسائی ہو سکی۔"

وہ دعائیں مانگ رہا تھا اور رو رہا تھا، رو رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا؛ اس کے آنسو تھمے ہی نہ تھے، مسلسل ہچکیوں کے سبب اس کی آواز کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا تھا پھر بھی اس کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھے رہے، وہ دعائیں مانگتا ہی رہا۔

"بارالہا! میں تجھ سے ایک ادنیٰ اور حقیر سی شے طلب کر رہا ہوں۔ بحر ناپیدا کنار سے ایک قطرۂ بے مایہ ہی مانگ رہا ہوں، میخانہ بردوش ساقی سے دردتہہ جام ہی کی درخواست کی ہے خانہ برانداز چمن سے پھول کی ایک پنکھڑی ہی کا طلبگار رہا ہوں۔

میرے رزاق! میں حج کرنا چاہتا ہوں، میں تیرے ہی گھر کی زیارت اور اس کا طواف کرنے کا آرزومند ہوں میں غلاف کعبہ کو اپنی آنکھوں سے لگانا چاہتا ہوں۔ میں اس پانی

سے وضو کرنا چاہتا ہوں جو تیرے ہی ایک محبوب بندے کی ٹھوکر سے پیدا ہوا ہے۔ میں اس سرزمین مقدس کا بوسہ لینا چاہتا ہوں۔ جس کو تیرے محبوب نے "روضه من رياض الجنة" کہا ہے اور ہاں میں ان ذرات کو بھی چومنا چاہتا ہوں جن کو تیرے حبیب کی پابوشی کا شرف حاصل ہوا۔ اس خطۂ محترم کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں جہاں جنید و بایزید جیسے عارفین حق نفس گم کردہ آتے ہیں"۔

رات دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی نورانی شعائیں آہستہ آہستہ دریچوں اور کھڑکیوں سے کمرے میں اترنے لگی تھیں لیکن اس کے ہاتھ دعاؤں کے لئے اب بھی اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اب بھی بہہ رہی تھیں وہ اب بھی سسکیاں بھر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا: ——

"رب العالمین! آج کئی برسوں سے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر میں نے کچھ پیسے جمع کیے ہیں۔ میں کئی کئی راتوں تک چند چھوہاروں سے روضہ افطار کر کے روزے پہ روضے رکھتا رہا ہوں۔ اور اس طرح میں اپنے یومیہ اخراجات میں تخفیف کر کے کچھ پیسے جمع کئے ہیں۔ لیکن حج کرنے کیلئے وہ پیسے اب بھی ناکافی ہیں۔ گھر کے تمام ظروف میں نے بیچ ڈالے گھر کے سارے سامان میں نے ہٹا دیئے، اس کے باوجود میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہو سکے جو سفر حج کیلئے زادِ راہ بن سکیں۔ میرے پاس دو اونٹنیاں ہیں، خیال تھا کہ ایک اونٹنی اپنے خاندان کی ضرورت کیلئے رکھ چھوڑوں اور ایک بیچ دوں، لیکن اس کی قیمت نہیں لگ رہی جو زادِ راہ کی کمی کو پورا کر سکے —— خداوندا! تو میرے لئے غیب سے زادِ راہ مہیا کر اور میرا حج قبول فرما۔"

ابھی وہ دعا مانگ ہی رہا تھا کہ دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی، اور ایک آنے والے نے "اسلام علیکم" کہہ کر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیئے —— اس نے کہا —— "اس دن آپ کی اونٹنی کی قیمت لگانے میں مجھ سے بھول ہوگئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اونٹنی مادہ بچہ جننے کی عادی ہے۔ نر بچہ جننا اس کی قسمت میں ہے ہی نہیں۔ لیکن فلاں شخص مجھے سے راستہ میں ملا اور اس نے بتایا کہ تمہاری اونٹنی نر ہی جنے گی۔ وہ اس معاملہ میں بڑا ماہر ہے اور اس کا

اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔اس کے کہنے کے مطابق میں ایک منزل جا کر واپس آیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کچھ اور پیسے دے کر اونٹنی اپنے ساتھ لیتا ہی جاؤں۔"

اس کی گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گھر سے ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے ہانپتے ہوئے کہا؟ "رات اس کی اونٹنی نے نَر بچہ جنا ہے"۔اب کیا تھا اونٹنی کا بھاؤ بڑھ گیا۔اس کی قیمت پہلے سے دگنی ہوگئی، لیکن وہ اب بھی ارزاں تھی۔اس کے کئی گاہک اور بھی نکل آئے۔ہر گاہک بڑھ چڑھ کر بولیاں بول رہا تھا۔اور اونٹنی کی قیمت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔اونٹنی اسی دن بک گئی اور اب اس کے پاس زادِ راہ سے بھی فاضل روپے ہو گئے۔

سفرِ حج کی تمام تیاریاں اس نے جلد جلد مکمل کیں کیونکہ کل صبح تڑکے ہی ایک قافلے کے ہمراہ وہ اپنے سفرِ حج کا آغاز کرنے والا تھا۔آج اس کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔آج کا دن اس کی زندگی میں کئی سال کے انتظار کے بعد آیا تھا۔اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی، اس کے دل میں شمعیں جلنے لگیں وہ فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا۔

لیکن ابھی اس کے چہرے سے مسکراہٹوں کی لکیر مٹنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا چھوٹا بچہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔بچہ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔اس نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو آنسوؤں کو باہر نکلنے کی اجازت مل گئی۔آنسوؤں کے قطرے آنکھوں سے ڈھلک پڑے اور وہ بے اختیار رونے لگا۔وہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا:

"پڑوسی کے گھر گیا تھا پڑوسی کے بچے گوشت کھا رہے تھے۔کسی نے میری طرف دیکھا تک نہیں"——اتنا کہنے کے بعد وہ زور زور سے پاؤں پٹکنے لگا۔اس نے چیخ و پکار سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔اس نے اپنی دونوں آنکھیں مل مل کر سرخ کر ڈالیں۔وہ ہزار سمجھانے پر بھی چپ نہیں ہوا۔وہ گوشت کھانا چاہتا تھا لیکن اس وقت گوشت آتا کہاں سے؟

شفقتِ پدری ننھے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکی۔دیارِ حبیب کا مسافر چپکے سے اٹھا اور پڑوسی کے گھر پہنچا——پڑوسی سے اس نے کہا:——

"ابھی تک تو ہم مسلمانوں میں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ جب کسی کو کوئی نعمت میسر آتی ہے تو ساری برادری میں بانٹ کر کھائی جاتی ہے۔لیکن تم غالباً پہلے مسلمان ہو جو اپنے اُصول

بھول گئے ہو۔ تم نے اپنے بزرگوں کی ریت ترک کر دی ہے اور معاشرے میں ایک نئی طرح ڈالنا چاہتے ہو —— اگر تم کو حقِ ہمسائیگی کا پاس لحاظ نہیں تھا۔ تو کم زکم مسلمانوں کی رسم و رواج ہی کا خیال کیا ہوتا؟"

یہ سن کر پڑوسی اپنی جگہ سے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس کے پاس آیا۔ دونوں دیر تک باہر کھڑے سرگوشیاں کرتے رہے اور پھر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

لیلائے شب نے ایک بھرپور انگڑائی لی اس کی کافر زلفیں اس کی بانہوں پر بکھر گئیں اور تاریک سائے چاروں طرف پھیل گئے۔ لیکن ان سایوں کے علاوہ ایک اور سایہ تھا جو آہستہ آہستہ ایک طرف بڑھ رہا تھا۔ سایہ بڑھتا رہا، سایہ بڑھتا ہی گیا اور پھر پڑوسی کے مکان کے پاس پہنچ کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ مسجد کے مینار موذن کی صدائے تکبیر سے گونج اٹھے۔

عازمین سفر نے رختِ سفر باندھا اور قافلے سے جا ملے۔ جرس کی آواز قافلے کی روانگی کا اعلان کر رہی تھی۔

دیارِ حبیب کے مسافر کو الوداع کہنے کے لئے گاؤں والوں کی ایک بھیڑ اس کے مکان کے گرد جمع تھی۔ لیکن خود وہ مسافر ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی پورے سامانِ سفر کے ساتھ اس سے کئی منزل تک پہنچانے کا عزم لے کر آئی تھی، عورتوں کی عماریاں اس کے پیچھے پیچھے چلنے کو تیار کھڑی تھیں، چھوٹے چھوٹے بچے اس عازم حج کے قدم لینے کو اپنے اپنے بستروں سے اٹھ آئے تھے۔ لیکن اس کے مکان کا دروازہ اب بھی بند تھا۔ یکا یک دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلا۔ پروانوں کی بھیڑ اس پر ٹوٹ پڑی اور مبارک باد کی دعاؤں سے فضا گونج اٹھی۔

اس کے لب کئی بار وا ہوئے۔ اور تھرتھرا کے رہ گئے۔ اس کے ہونٹوں کو کئی مرتبہ جنبش ہوئی لیکن اس کی آواز حلق ہی میں اٹک کے رہ گئی۔ آخر بڑی مشکلوں سے اس نے اپنے اوپر قابو پایا۔ اور اپنی ساری توانائیوں کو یکجا کر کے اپنے اندر یہ کہنے کی جرأت پیدا کی کہ وہ حج کو نہیں جا رہا ہے —— اس کی زبان سے اس لفظ کا نکلنا تھا کہ سارے لوگ سکتے میں آ گئے گھر والوں کی خوشیاں اوس پڑ گئیں —— اور مجمع یہ کہتے ہوئے منتشر ہو گیا ——

"یہ شخص شروع ہی سے ایسا ہے اس نے ایک خاص مقصد کے تحت اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا۔اور وہ مقصد اسے پہلے ہی حاصل ہو گیا،لوگ اس کی قدر و منزلت کرنے لگے، سماج میں اس کی وقعت بڑھ گئی اور سبھوں نے اسے اپنا مقتدا تسلیم کر لیا، اب اسے حاجی کہلوانے کی ضرورت نہیں ہے"۔

اور ایک منچلے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:——

"یہ شخص روزے نماز کا پابند صرف اس لیئے ہے کہ اس کے لئے کوئی رقم صرف کرنی نہیں پڑتی لیکن حج میں تو ایک بھاری رقم کا صرفہ ہے۔ یہ رقم اسے صرف کرتے آنکھ لگتی ہے اب اسی رقم سے یہ جائداد خریدے گا۔"

کارواں جا چکا تھا۔اور اب صدائے جرس بھی نہیں آرہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو شخص تمام لوگوں کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔اب وہی ہدفِ ملامت تھا۔

حج کا موسم شروع ہو چکا تھا۔تمام خطۂ ارض سے عازمین حج نو لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں حج زیارت سے مشرف ہونے کیلیئے حرم کی سرزمین پر جمع ہو گئے تھے۔ "لبيك اللهم لبيك" کی صدائے بازگشت سے دشت و جبل گونج رہے تھے۔میدان عرفات میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔منیٰ اور مزدلفہ کی وادیوں میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔اللہ کے ایک مقبول و محبوب بندے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جبل عرفات پر محوِ عبادت تھے۔ان کے کان میں ایک آواز آئی ——"امسال کسی کا حج قبول نہیں ہوا"—— یہ آواز ہاتفِ غیب کی تھی۔ یہ آسمان کی لامحدود بلندیوں سے اتری تھی۔حضرت ذوالنون اس آواز سے چونک اٹھے۔انہیں حیرت ہوئی۔حیرت کی بات بھی تھی۔نو لاکھ کے جمِ غفیر میں ایک بھی اس قابل نہیں ہوا کہ اس کا حج قبول کیا جاتا۔یاللعجب! لیکن ابھی وہ واقعہ کی نوعیت پر غور کر رہے تھے کہ دوسری آواز آئی ——"فلاں کے صدقے میں سبھوں کا حج قبول کیا جاتا ہے۔جو حج کی نیت کرنے کے باوجود یہاں تک نہیں آسکا"—— یہ آواز پہلے سے زیادہ چونکا دینے والی تھی۔اس آواز میں متحیر کر دینے والا عنصر زیادہ شامل تھا۔حضرت ذوالنون کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ جو شخص حج کی نیت کر لینے کے بعد بھی حج سے محروم رہے گا! وہ مستوجب

عذاب ہونے کی بجائے الٹا سزاوار انعام کیوں کر ہو گیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ وہ مناسک حج سے فراغت کے بعد اس فلاں آدمی سے ضرور ملیں گے۔ اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کس عمل کے صلے میں اسے یہ اعزاز ملا۔

حضرت ذوالنون مہینوں کی مسافت طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں اس سے ملاقات ہونی تھی۔ اس سے ملاقات کی اور سفر حج نہ کرنے کا سبب پوچھا اس نے پڑوسی کا سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد بتایا کہ جب وہ پڑوسی کے مکان پر پہنچا تو اس کا پڑوسی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آپ کے پاس آیا، اس میں چلنے کی سکت نہ تھی، اس کی آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں اور اس کے چہرے سے افلاس ٹپک رہا تھا۔ اس کے بچے سامنے کی چٹائی پر پڑے تھے، اسے دیکھ کر بچوں نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کچھ اٹھ نہیں سکے، کچھ اٹھے بھی تو ناتوانی نے انہیں فوراً سلا دیا۔

پڑوسی نے بتایا:—

''پانچ دنوں کے مسلسل فاقوں نے ان سبھوں کو ہلاکت کے قریب کر دیا تھا۔ اتفاق سے آج وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا جنگل کی طرف جا نکلا۔ وہاں اسے مرے ہوئے ایک گدھے کی لاش زمین پر پڑی مل گئی۔ یہی مردار گدھا آج اس کی اور اس کے بچوں کی غذا تھی۔''

اس واقعہ نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا اور اسی وقت اس نے ٹھان لی کہ اب وہ حج نہیں کرے گا اور جو رقم اس نے حج کے زادِ راہ کے طور پر مہیا کر رکھی ہے اس خاندان پر صرف کر دے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اس کے گھر کے سب لوگ سو گئے۔ وہ چپکے سے اٹھا اور اشرفیوں کی تھیلی پڑوسی کو دے آیا۔

اتنا کہنے کے بعد وہ چند لمحے کے لئے رکا اور پھر اس نے کہنا شروع کیا:—

''یہ بات آج تک اس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہیں ہے۔ کہ اس نے عین وقت پر کیوں سفر حج ملتوی کر دیا اور اشرفیوں کی وہ تھیلی کیا ہوئی جو برسوں کی لگاتار کوششوں کے بعد اس کے ہاتھ میں آئی تھی۔''

آخر میں اس نے یہ بھی کہا:—

"اسے حج نہ کرنے کا غم ضرور ہے، لیکن اس سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ ایک مسلم خاندان کو اس نے ہلاکت سے بچالیا۔"

حکایت کی زبان میں اس کردار کے ہیرو کو حضرت احمد بن اسکاف دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپ کی زاہدانہ زندگی اور آپ کے کردار وعمل کے سارے نقوش تاریخ کے صفحات میں منضبط ہیں۔

ضیآء جالوی

ایک لمحہ آتشیں

کہتے ہیں کہ ایک دن شہنشاہ ہندوستان حضرت اورنگزیب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دیوان عام میں جلوہ گستر تھے کہ نقیب نے آ کر اطلاع دی۔

جہاں پناہ! ایک فریادی محل کے دروازے پر کھڑا ہے باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ حکم ہوا باریاب کرو۔

چند ہی لمحے کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دربار میں حاضر ہوا شہنشاہ نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا دور دور سے آئے ہوئے فریادیوں کے مقدمات کی سماعت سے فارغ ہو چکنے کے بعد اب شہنشاہ اس اجنبی شخص کی طرف مخاطب ہوئے:

''دربارِ شاہی میں کیا فریاد لائے ہو؟''

''جہاں پناہ! میں ایک بہروپیا ہوں، صرف اس تمنا میں گجرات سے حاضر ہوا ہوں کہ شہنشاہ ہند کے دربار سے اپنے فن کا کوئی اعزاز حاصل کروں اس دربار میں اہلِ کمال کی قدر دانی کا بڑا شہرہ سنا ہے''۔

اورنگ زیب نے زیرِ لب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا:

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔ اہلِ کمال کی قدر دانی ہمیشہ سے شاہی درباروں کا شیوہ رہا ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں کہ اپنے فن کا مظاہرہ کرو۔ ایک بہروپیا کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے وجود کو اصلیت کے سانچے میں اس طرح ڈھال لے کہ نقل کا پہچاننا مشکل ہو جائے۔ تم نے اگر مجھے دھوکا دے دیا تو میں یقین کر لوں گا کہ تم اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے ہو۔ اسی دن ایک قدر دان کی طرح میں تمہارے کمال کی داد دوں گا۔''

شہنشاہ کا یہ جواب سن کر خوشی خوشی بہروپیا دربار سے رخصت ہوا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ

کر کئی دن تک یہ سوچتا رہا کہ کون سا روپ اختیار کیا جائے کہ بادشاہ کو بھرپور دھوکا دیا جا سکے۔

ایک مہم سے واپس ہوتے ہوئے شہنشاہ راستے میں بیمار پڑ گئے۔ دہلی کی راجدھانی میں ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف عبادت خانوں اور درگاہوں میں دعائیں مانگی جانے لگی شاہی بیگمات نے روزوں کی نذر مان لی۔ گلی گلی میں محتاجوں اور مسکینوں کو خیرات لٹائی گئی۔

علاج کیلئے ملک کے کونے کونے سے ماہر طبیبوں کا تانتا بندھ گیا۔ چند ہی دنوں میں شہنشاہ روبہ صحت ہونے لگے۔

غسلِ صحت کے دن ساری راجدھانی خوشی کے شادیانوں میں ڈوب گئی۔ بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد آج پہلی مرتبہ شہنشاہ دربارِ عام میں تشریف لانے والے تھے۔ مشتاقانِ دید سے دربار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے ہوئے ہر شخص بادشاہ کی آمد کا منتظر تھا۔ کہ اتنے میں نقیبوں نے آواز دی ——

سارا دربار سرو قد کھڑا ہو گیا۔ مبارک باد اور ایامِ اقبال کی دعاؤں کی گونج میں شہنشاہ تختِ آبنوس پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسی درمیان میں ایک چوبدار نے آ کر خبر دی ——

''جہاں پناہ کی علالتِ مزاج کی خبر ایران تک پہنچ گئی ہے علاج کیلئے شاہ ایران نے اپنا خصوصی طبیب دربارِ عالی میں حاضر کیا ہے۔ وہ باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے''۔

شہنشاہ نے اس خبر کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے باریاب ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ سارے درباری ایران کے شاہی قطب کو دیکھنے کے لئے متوجہ ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد حکمائے یونان کی دستار و عبا میں ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا اس کی پیشانی سے حکمت و دانائی کی ذہانت ٹپک رہی تھی۔ اس کے پیچھے غلاموں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے سروں پر دواتوں کے چھوٹے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ سارا دربار بادشاہ ایران کے جذبۂ ہمدردی کی ستائش سے گونج اٹھا۔

شہنشاہ تھوڑی دیر تک نظر جمائے ہوئے آنے والے کو دیکھتے رہے۔ ایران کا طبیب جیسے ہی پابوسی کیلئے تخت کے آگے جھکا ——شہنشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

''میں نے تمہیں پہچان لیا''۔

یہ سنتے ہی مارے شرم کے بہرو پیا پانی پانی ہوگیا اسے اپنے فن کی ناکامی پر اتنا قلق ہوا کہ الٹے پاؤں وہ دربار سے واپس لوٹ گیا۔ ایک عرصہ دراز تک وہ اپنی شکست کے غم سے نڈھال رہا۔ آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو جوڑ کر کھڑا کیا۔

آج رمضان المبارک کی 29 تاریخ تھی۔ غروب آفتاب کے بعد ہی افق مغرب پر ہلال عید تمنائیوں کی نگاہیں جم گئیں چند ہی لمحے کے بعد شور اٹھا۔ "عید کا چاند نظر آ گیا۔"

قلعہ معلّٰی سے توپیں سر ہوئیں اور سارا شہر مسرت و نشاط کی بارشوں میں نہا گیا۔ ہر طرف عید کی چہل پہل شروع ہوگئی۔ عزت و وقار کی کھلی ہوئی فضا میں عید کی حقیقی خوشی ہر گھر سے پھوٹ رہی تھی۔ رات گئے تک علماء و مشائخ کی بارگاہوں سے شکر خداوندی کی تہنیتیں بلند ہوتی رہیں اور عاشقان الٰہی تسبیح و تہلیل کے انوار میں نہاتے رہے۔

آج ساری رات کیلئے قلعۂ معلّٰی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مملکت کے سارے مساکین امنڈے ہوئے سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔ اعلانِ عام تھا کہ عید کے دن شاہراہوں پر کوئی بھی بھوکا، ننگا اور مفلوک الحال نظر نہ آئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے اہل حوائج کی حاجتیں پوری کردی جائیں۔

راجدھانی میں جشنِ مسرّت کا یہ سماں ساری رات قائم رہا۔ صبح ہوئی تو ایک نئی فصلِ بہار کی مسکراہٹیں ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ ساری فضا رنگ و نور میں شرابور تھی۔ نورس کلیوں، شگفتہ پھولوں اور مہکتے ہوئے غنچوں کے رنگ برنگ جلوؤں سے سارا شہر گلستان میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اسلامی اقتدار کا لہراتا ہوا پرچم آج آسمان کی رفعتوں کو آواز دے رہا تھا۔ یہی عالم جاں نواز تھا کہ قلعۂ معلّٰی سے نمازِ عید کیلئے پہلی توپ سر ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہراہوں پر فرزندانِ توحید کی قطاریں لہراتی موجوں کی طرح امنڈنے لگیں۔

دوسری توپ سر ہوتے ہی قلعۂ معلّٰی سے شاہی جلوس مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔

آج امیر کشورِ ہند کی پیشانی پر عجز و نیاز بندگی کی جو چاک چمک رہی تھی اس کی کیفیت دیکھ کر لوگوں کے قلوب ہل گئے۔ کتنی آنکھیں خشیت الٰہی کے تاثر سے آبدیدہ ہوگئیں۔ انہی

رقت انگیز جذبات عبودیت کے سائے میں عید کی دوگانہ ختم ہوئی۔

قلعہ معلٰی کی ایک پرانی رسم تھی کہ نمازِ عید کے بعد والیان ریاست اور روسائے مملکت کی طرف سے شہنشاہ کے حضور میں نذر گزاری جاتی تھی۔ اب اس کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔ قیمتی تحائف اور بیش بہا جواہرات کے تھال لئے ہوئے نوابوں، راجاؤں اور جاگیرداروں کی منڈلیاں قلعہ معلٰی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ صدر دروازے سے لے کر دیوان عام تک محل کا سارا حصہ دولہن بنا ہوا تھا۔

نقیبوں کی گونج میں شہنشاہ دیوان عام میں تشریف لائے۔ تخت آبنوس پر جلوہ گستر ہوتے ہی سلامی اور عید کی مبارک باد کا شور بلند ہوا۔

والیان ریاست اور روسائے مملکت اپنی اپنی کرسیوں پر ایک قطار سے بیٹھے ہوئے تھے۔ باری باری ایک ایک کر کے سب نے شہنشاہ کے حضور اپنی نذر پیش کی، اخیر میں ترکستان کا ایک جوہری اٹھا اور اس نے شہنشاہ کے حضور میں ایک چھوٹا سا صندوق پیش کرتے ہوئے کہا:

"اس میں بدخشاں کا وہ لعل شب چراغ ہے جو ایک ہزار سال تک مریخ کی خنک چاندنی میں پرورش پاتا رہا۔ تب جا کر آج اسے پائے گاہ عالی تک پہنچنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ کبۂ اقبال کی تابندگی سلامت رہے بزم فلک کا یہ پروردہ نگینہ اس وقت روئے زمین پر ایسا ہی منفرد اور لاشریک ہے جیسے جہاں پناہ کی سطوت شاہانہ!

شبہائے تار کی روشنی، دیدۂ عقل کا چراغ، چمنستان آرزو کا لالہ، بہت سارے ناموں سے ترکستان کے جوہریوں نے اسے موسوم کیا ہے۔

فرمانروائے ہند کے حضور میں یہ تحفہ نایاب پیش کرتے ہوئے آج میری مسرتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے"۔

یہ کہتے ہوئے صندوق کو پائے گاہ شاہی میں رکھ کر جیسے ہی واپس لوٹنا چاہتا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب نے زیر لب تبسم فرماتے ہوئے جواب دیا:

"اس بار بھی ہم نے تمہیں پہچان لیا"۔

یہ الفاظ تیر کی طرح اس کے جگر میں ترازو ہو گئے۔ عالم اضطراب میں بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو سنبھال سکا۔ اس بار کی چوٹ اتنی گہری تھی کہ بہت دنوں تک اس کے دل کا زخم رستا رہا۔ ہزار شکست و ریخت کے بعد بھی اس بار اس نے اپنا حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس کے فن کی غیرت جاگ اٹھی اور آخری بار وہ اپنی قسمت آزمائی کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد دکن کے علاقے سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہاں بہت سے راجاؤں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور وہ بغاوت کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

مقتضائے وقت کے مطابق آتش بغاوت فرو کرنے اور باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے شہنشاہ اورنگ زیب نے بذاتِ خود دکن کی مہم پر روانگی کا ارادہ فرمالیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ایک عظیم لشکر کی ترتیب کا کام شروع ہو گیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد ایک معین تاریخ پر شہنشاہ کی روانگی طے پا گئی۔

آج صبح سویرے حضرت اورنگ زیب ایک لشکر جرار اپنے جلو میں لئے ہوئے دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ جن جن گذرگاہوں سے شہنشاہ اورنگ زیب گذرتے تھے۔ سارے علاقے میں دھوم مچ جاتی تھی۔ سفر کا روٹ آبادیوں اور شہروں سے ہٹ کر زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلوں کو عبور کرتے ہوئے بنایا گیا تھا۔

صبح و شام موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ مہم نہایت سنگین ہوتی جا رہی تھ۔ باغیوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے آپس میں متحد ہوتے جا رہے تھے۔ اس طرح دکن میں ایک باغیانہ قوت مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے اس سفر میں ہر دوسرے تیسرے پڑاؤ پر نئی نئی کمک فوج میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔

حضرت اورنگ زیب طبعاً بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اس لئے دستور یہ تھا کہ راستے میں جہاں جہاں بھی کسی بزرگ کا مزار ملتا قافلہ روک کر مزار پر حاضری دیتے، فاتحہ پڑھ کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے اور روانہ ہو جاتے۔

دورانِ سفر میں ایک پہاڑی سلسلے کو عبور کرتے ہوئے ایک جگہ سے گذر رہے تو دیکھا کہ کئی ہزار انسانوں کا ہجوم لگا ہوا ہے۔ خیموں اور پھونس کے جھونپڑوں کی ایک بستی بس گئی

ہے ـــــ کہسار کے ویرانوں میں آدمیوں کا یہ میلہ دیکھ کر شہنشاہ کو بڑی حیرت ہوئی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب ہی پہاڑی کی کھوہ میں ایک خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ جن کی زیارت اور حصولِ فیض و برکت کیلئے مہینوں سے یہاں میلہ لگا ہوا ہے۔ سینکڑوں بندگانِ خدا یہاں سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹے ہیں۔

لوگوں نے بتایا کہ اُن کی عجیب شان ہے نہ وہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ کسی سے بات کرتے ہیں، سدا آنکھیں بند کیے ہوئے یادِ الٰہی میں محو رہتے ہیں۔ ان کے قریب پہنچ کر دِل کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ان کے پُر نور چہرے پر نظر ڈالنے کی تاب بڑی مشکل سے کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔

یہ حالات سُن کر حضرت اورنگ زیب کے دل میں بھی ان کی زیارت کا اشتیاق ہو گیا۔ میر لشکر کو حکم دیا کہ یہاں پڑاؤ ڈال دیا جائے۔ دم کے دم میں پہاڑ کے طویل و عریض دامن ایک شہر میں تبدیل ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی اس لئے طے پایا کہ صبح کے اجالے میں درویش کی زیارت کیلئے شہنشاہ تشریف لے جائیں گے۔

صبح ہوتے ہی پہاڑ کی کھوہ تک ساری گذرگاہ کی سپاہیوں نے ہموار کر دیا ایک خدا رسیدہ بزرگ کی زیارت کی نیت سے شہنشاہ نے غسل کیا۔ نئے کپڑے زیب تن فرمائے۔ دو رکعت نماز نفل ادا کی اور برہنہ پا چل کھڑے ہوئے۔ عقیدت کا یہ اہتمام شوق دیکھ کر لوگوں نے بادشاہ کی نیک طینتی اور درویش نوازی کا اعتراف کر لیا۔ پہاڑ کے دہانے پر پہنچ کر شہنشاہ رک گئے۔ خادم نے بتایا کہ ابھی حضرت عالمِ استغراق میں ہیں۔ تھوڑی دیر توقف کیا جائے۔ شہنشاہ مجسمۂ عقیدت بنے ہوئے انتظارِ شوق میں کھڑے رہے۔ کچھ وقفے کے بعد خادم نے آ کر اطلاع دی کہ اب اندر تشریف لے چلئے۔ اندر کے حصے میں چونکہ رات کی طرح اندھیرا تھا۔ اس لئے جگہ جگہ کا فوری مشعل روشن کر دی گئی تھی۔ تاکہ شہنشاہ کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

خدا رسیدہ بزرگ کے قریب پہنچ کر بادشاہ بہت زیادہ متاثر ہوئے فرشِ زمین پر اَدب سے دوزانو بیٹھ گئے۔ دیر تک ان کے روحانی فیوض و برکات کے امیدوار بن کر خاموش بیٹھے

رہے۔کافی عرصہ گذر جانے کے بعد بادشاہ نے اپنی مہم کی کامیابی کیلئے دعا کی درخواست کی۔

لیکن درویش نے بادشاہ کی عرضداشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔وہ بدستور اپنے عالم محویت میں ڈوبا ہوا تھا۔اس کے استغنا کی یہ شان دیکھ کر بادشاہ اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔اس لئے بادشاہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔خادم باہر نکل چکا تھا۔اب مکمل تنہائی کا عالم تھا۔بادشاہ نے دم رخصت درویش کی خدمت میں اشرفیوں کا ایک توڑا بطور نذر پیش کیا۔اور اٹھتے ہوئے جیسے ہی وہ درویش کی دست بوسی کیلئے جھکا کہ بہروپیا نے دونوں ہاتھ سے بادشاہ کے قدم تھام لیے۔

"بس ہو گیا جہاں پناہ! میرے فن کا یہ آخری اسٹیج تھا۔میں درویش نہیں ہوں۔وہی بہروپیا ہوں جسے دوبار آپ نے شکست دی ہے اتنی بڑی گستاخی مجھ سے سرزد نہیں ہو سکتی کہ آپ میرے ہاتھوں کا بوسہ لیں"۔

یہ جواب سن کر بادشاہ پر ایک سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی۔عالم تحیر میں دیر تک وہ خاموش رہا۔تھوڑی دیر کے بعد جب حیرت کا طلسم ٹوٹا تو ارشاد فرمایا:

"آج میں نے تسلیم کر لیا کہ تم اپنے فن میں کامل ہو۔اب اس خوشی میں کہ تم نے میرے اوپر فتح حاصل کر لی ہے۔اشرفیوں کی یہ تھیلی قبول کر لو۔تمہارے فن کے اعزاز میں صحیح حق اس وقت ادا کروں گا جبکہ قلعۂ معلیٰ دہلی میں تم مجھ سے ملاقات کرو گے۔دکن کی مہم سے فارغ ہو کر جب میں دارالخلافہ واپس لوٹوں گا تو تمہارا نہایت شدت سے انتظار کروں گا"۔

یہ کہتے ہوئے جیسے ہی بادشاہ نے قدم آگے بڑھایا بہروپیا نے دامن تھام لیا:

"جہاں پناہ! اشرفیوں کی تھیلی لے کر اب میں کیا کروں گا۔اب تو دل کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔آج تک حقیقت کے جس چہرے پر بے شمار پردے پڑے ہوئے تھے۔اب کھلی آنکھوں سے اسے بے نقاب دیکھ رہا ہوں فقیر درویش کی نقل میں جب یہ تاثیر ہے کہ کشور ہند کے شہنشاہ کی معزز پیشانی میرے آگے جھک گئی تو اصل کی طرف اگر میں رخ کر لوں تو کسی اور اعزاز کی ہمیں ضرورت کیا ہے؟

یہ کہتے ہوئے ایک چیخ ماری اور جیب و گریباں کی دھجیاں اڑاتا ہوا چشم زدن ———

میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

خُدا کی شان بھی کیسی بندہ نواز و بے نیاز ہے۔ کوئی عمر بھر جھک مارتا ہے تو دروازہ نہیں کھلتا اور کسی کیلئے ایک لمحۂ آتشیں زندگی بھر کی غفلتوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

پھر بادشاہ کی توجہ تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف مبذول ہوئی۔

''آہ! خدا شناسی اور فقیر و درویشی کے نقالوں نے دنیا میں کیسے کیسے لوٹا ہوگا۔ کون جانتا ہے؟ اس راہ کا فریب خوردہ ایک میں ہی نہیں تھا۔ میری طرح لاکھوں افراد شیطان کے مکر کا شکار ہوئے ہوں گے۔

صد حیف! کہ اس راہ کے فریب سے بچنا کتنا مشکل ہے؟ تسبیح و مصلی، تقدیس و تہلیل اور ریاضت و عبادت کے چمکدار سکون پر کون نہیں ریجھ جائے گا؟

پروردگار! تو ہی اپنے محبوب کی بھولی بھالی امت کو وقت کے فریب کاروں سے بچانا''۔

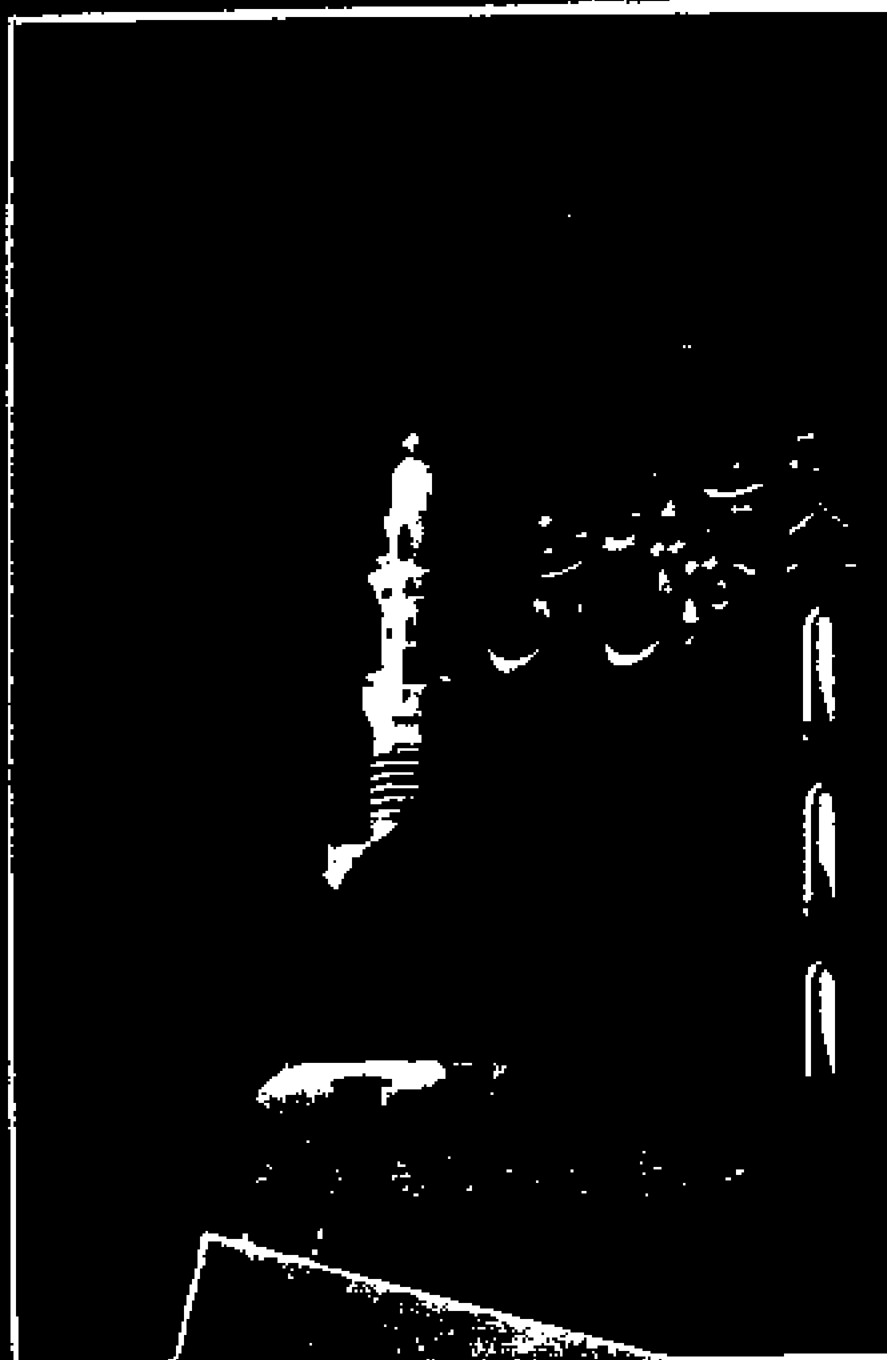
علّامہ ارشد القادری

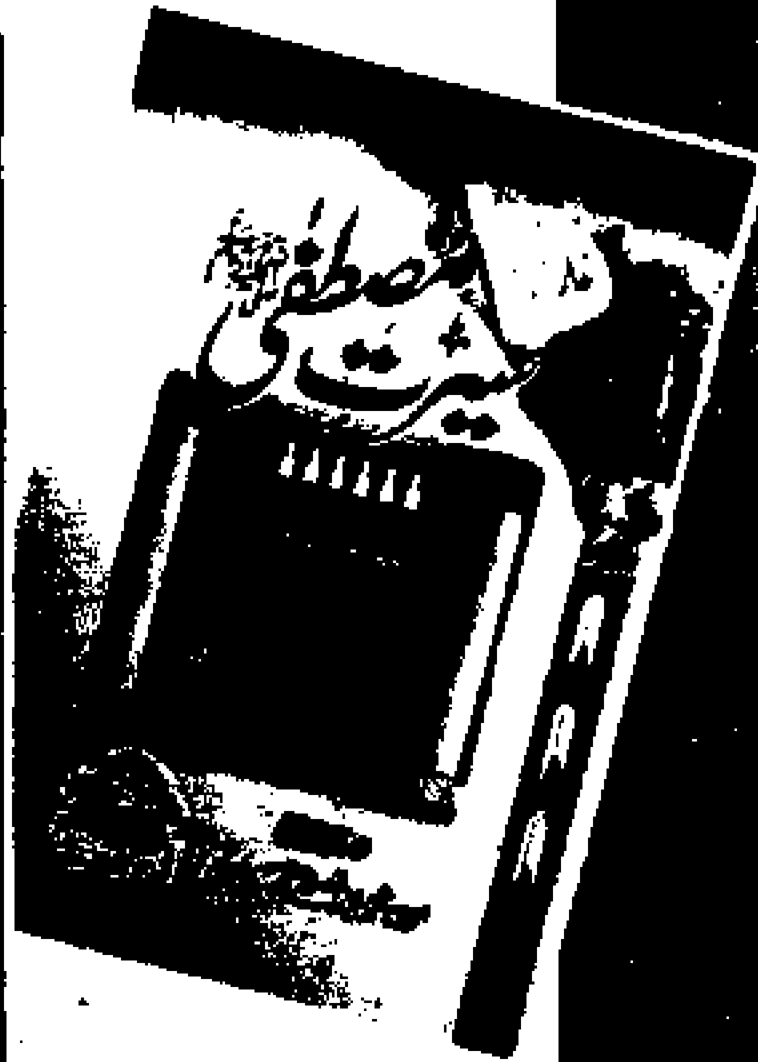
تمت بالخیر

زاویہ پبلشرز کی دیگر اسلامی کتب

حضرت علامہ شاہ شاہ تراب الحق قادری کے قلم سے

تصوف وطریقت	90
خواتین کے دینی مسائل	75
ضیاء الحدیث	90
جمالِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	90
امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ	120
مزاراتِ اولیاء اور توسل	75
فلاح دارین	60
نماز کی کتاب	30
مبلغ بنانے والی کتاب	60
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بچوں سے محبت	50
دینی تعلیم	30
تفسیر سورۃ فاتحہ	25
مبارک راتیں	25
اسلامی عقائد	20
شریعت محمدی کے ہزار مسائل	135

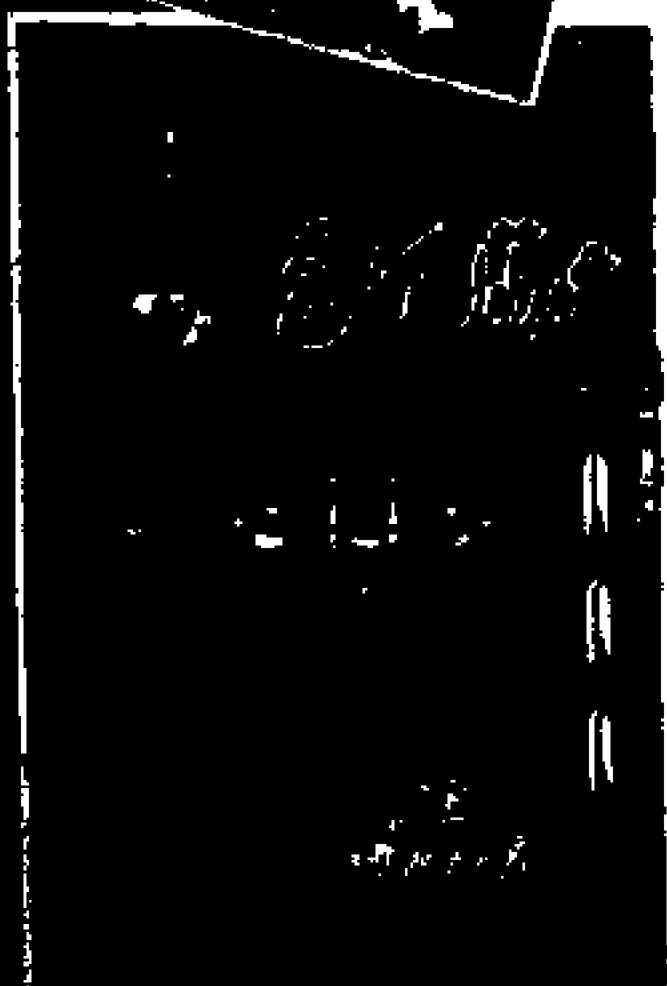



سیرت مصطفیٰ

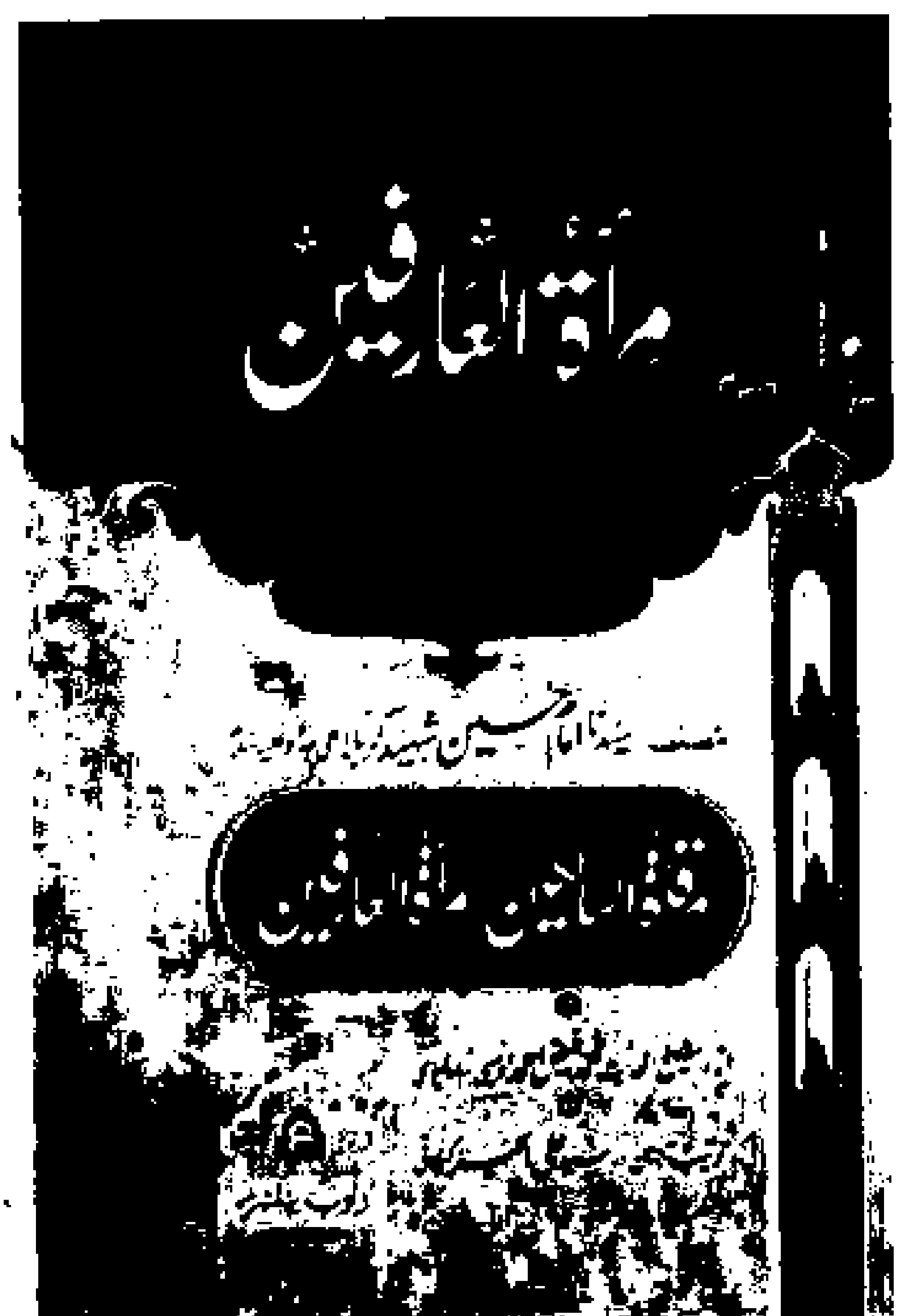

سیف الملوک و بدیع الجمال










مذاق العارفین

